جامعہ حفصہ کا سانحہ

حالات وواقعات اور دینی قیادت کا لائحہ عمل

ابوعمار زاہدالراشدی

الشریعہ اکادمی

(سلسلہ مطبوعات: ۳)

کتاب: جامعہ حفصہ کا سانحہ: حالات وواقعات اور دینی قیادت کا لائحہ عمل

ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

فون: 055-4271741 / 4000394

aknasir2003@yahoo.com

اشاعت دوم: اگست ۲۰۰۷

قیمت: ۶۰ روپے

فہرست

ضمیمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمدہ تبارك وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

جامعہ حفصہ اور لال مسجد اسلام آباد کے تنازع کا جب آغاز ہوا تو راقم الحروف نے اس کے مختلف پہلوؤں پر اسی وقت سے اپنے تاثرات واحساسات کو قلم بند کرنا شروع کر دیا تھا جو مختلف کالموں اور مضامین کی صورت میں ماہنامہ الشریعہ، روزنامہ اسلام اور روزنامہ پاکستان میں شائع ہوتے رہے اور ان کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے مضامین اور کالموں میں متعلقہ مسئلہ کی معروضی صورت حال کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں دینی نقطہ نظر کو بھی متوازن انداز میں پیش کر دیا جائے تاکہ قارئین کو کسی فیصلے تک پہنچنے میں آسانی رہے۔

دینی نقطہ نظر سے میری مراد کسی بھی مسئلے کے حوالے سے قرآن وسنت کے ارشادات وفرمودات کی وہ تعبیر وتشریح ہوتی ہے جو امت کے جمہور اہل علم اور خصوصاً اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی اکابر نیز حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تعبیرات وتشریحات کے ساتھ ساتھ عقل عام (Common Sense) کے ناگزیر تقاضوں سے بھی ممکنہ حد تک مطابقت رکھتی ہو۔ میں نے خود کو ہمیشہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے فکر اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تحریک کا فرد سمجھا ہے، اسی دائرے میں رہتے ہوئے حتی الوسع دینی، علمی

اور فکری جدوجہد میں کچھ نہ کچھ حصہ ڈالتا چلا آ رہا ہوں اور اسی کو اپنے لیے باعث سعادت ونجات تصور کرتا ہوں۔ بعض مسائل پر میری طالب علمانہ طور پر آزادانہ رائے بھی ہوتی ہے اور بسا اوقات اس کا اظہار بھی کرتا ہوں، مگر خود میرے نزدیک بھی اس کی حیثیت محض ایک رائے کی ہوتی ہے اور جمہور اہل علم کی اجتماعی رائے کے علی الرغم میں نے نہ کبھی اس پر اصرار کیا ہے اور نہ ہی اس پر عمل ضروری سمجھا ہے، البتہ رائے کا حق ضرور رکھتا ہوں اور بوقت ضرورت اسے استعمال بھی کرتا ہوں۔

لال مسجد کے تنازع اور سانحہ کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو ایک بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ملک میں نفاذ اسلام اور منکرات وفواحش کے سد باب کے لیے جدوجہد کے روایتی اور معروف طریقے کافی ہیں یا افغانستان کی طرح اسے باقاعدہ جہاد کا عنوان دینا اور اسے مسلح احتجاج یا تصادم کی شکل دینا بھی ضروری ہے؟ اب سے پچیس برس قبل افغانستان کو روسی استعمار کی مسلح مداخلت اور معاشرہ میں لادینیت کے فروغ کے سنگین مسئلہ کا سامنا تھا جس کا حل افغان علما اور عوام نے مسلح جدوجہد کی صورت میں نکالا اور روس مخالف بین الاقوامی حلقوں کے تعاون سے اس میں کامیابی حاصل کر کے ایک مرحلے میں طالبان کی حکومت کے نام سے اسلامی امارت بھی قائم کر لی، لیکن اس مرحلے تک ان کے پہنچنے میں بھرپور تعاون کرنے والے بین الاقوامی حلقوں نے اس سے آگے ان کی کسی بھی پیش رفت کو خود اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ان کا راستہ بزور قوت روک دیا اور طاقت کے بل پر انھیں اقتدار سے ہٹا کر ربع صدی قبل کی صورت حال دوبارہ قائم کر دی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس وقت افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح افواج افغان عوام پر سنگین تانے ہوئے تھیں اور اب ان کی جگہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مسلح افواج نے لے لی ہے۔

پاکستان میں ملک کے اسلامی نظریاتی تشخص کے تحفظ، نفاذ اسلام اور منکرات وفواحش کے تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے ہمارے بہت سے دوست اسی تجربے کو دہرانے کے خواہش مند ہیں اور ان نیک مقاصد کے لیے جہاد کا عنوان اور مسلح جدوجہد کا طریق کار اپنانے کے لیے بے چین ہیں۔ ہمارے نزدیک لال مسجد کا یہ معرکہ اسی بے چینی کے اظہار کی ایک ابتدائی شکل ہے۔

ہمیں ان دوستوں کے خلوص، جذبہ ایمانی اور ایثار وقربانی کے عزم میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی ہم کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے کہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے تحفظ، ملک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور منکرات وفواحش سے پاکستانی معاشرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے سیاسی عمل، دستوری جدوجہد اور جمہوری ذرائع اب تک پوری طرح کامیاب ثابت نہیں ہو پا رہے جس کے اسباب ایک مستقل بحث کے متقاضی ہیں، لیکن کیا اس کے بعد پرامن اور عدم تشدد پر مبنی جدوجہد کا راستہ چھوڑ کر مسلح جدوجہد کا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوگیا ہے؟ یہ سوال اتنا آسان نہیں ہے کہ اس کا جواب فوری طور پر ہاں میں دے دیا جائے، اس لیے کہ مسلح جدوجہد کے وجوب یا کم از کم جواز کے لیے صرف مذکورہ بالا اسباب وعوامل کافی نہیں ہیں بلکہ اور بھی بہت سے امور ہیں جن کا نہ صرف حکمت وتدبر بلکہ شرعی اصول وقواعد کے حوالے سے بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے اور ہماری طالب علمانہ رائے میں عالمی حالات کا معروضی تناظر، شریعت اسلامیہ کے مسلمہ قواعد وضوابط اور حکمت ودانش کے ناگزیر تقاضے موجودہ حالات میں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم پاکستان میں کسی دینی جدوجہد کے لیے ہتھیار اٹھائیں، دستور وقانون کو چیلنج کریں یا معروف تصور کے مطابق جہاد کا عنوان اختیار کر کے مسلح جدوجہد کی کوئی صورت پیدا کریں۔

برطانوی استعمار کے خلاف جنوبی ایشیا کی آزادی کی جدوجہد میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ مسلح جدوجہد کے آخری اور پرامن جدوجہد کے پہلے علمبردار تھے۔ ان کی جوانی آزادئ وطن کے لیے مسلح جدوجہد کا تانا بانا بنتے ہوئے بسر ہوئی جو تحریک ریشمی رومال کے نام سے تحریک آزادی کا ایک نمایاں باب ہے، لیکن انھی شیخ الہند کا بڑھاپا عدم تشدد پر مبنی اور پرامن جدوجہد کی تلقین سے عبارت ہے۔ اس کے بعد سے آزادئ وطن اور دیگر ملی ودینی مقاصد کے لیے عدم تشدد پر مبنی پرامن تحریکات کا نقطہ آغاز وہی ہیں اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری اور دیگر اکابر کے متعین کردہ اسی راستے اور انھی خطوط پر دینی جدوجہد کو آگے بڑھانا ہمارے نزدیک شریعت اور حکمت دونوں کا تقاضا ہے۔

لال مسجد کی جدوجہد کے بارے میں راقم الحروف نے جو کچھ لکھا ہے، اسی پس منظر میں لکھا ہے اور ہم پورے شرح صدر کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت اس موقف پر اب بھی قائم ہیں۔

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ نے لال مسجد کی جدوجہد اور پھر اس کے الم ناک سانحہ کے بارے میں میرے مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین اور کالموں کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے جس کا پہلا ایڈیشن نکل چکا ہے اور اس کے بعد لکھے جانے والے مزید مضامین کو شامل کر کے اس کا دوسرا ایڈیشن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ چونکہ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، اس لیے حالات کے اتار چڑھاؤ کے اثرات ان میں بعض مقامات پر قارئین کو محسوس ہوں گے، تاہم مجموعی تاثرات و احساسات اور جذبات و خیالات کا دائرہ چونکہ ایک ہی ہے، اس لیے قارئین کو اس سلسلے میں زیادہ الجھن پیش نہیں آئے گی۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں دین وملت کے لیے صحیح رخ پر سوچنے اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین۔

(۱۴ راگست ۲۰۰۷)

''غیر قانونی'' مساجد کو مسمار کرنے کا مسئلہ

اسلام آباد میں مبینہ طور پر غیر قانونی مساجد میں سے چند مساجد کو مسمار کرنے اور دیگر مساجد کو گرانے کا نوٹس دیے جانے سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، وہ ایک نئے بحران کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور دینی جماعتوں کا احتجاج اس سلسلے میں منظم ہوتا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ مساجد اور کچھ مدارس بھی اجازت کے بغیر تعمیر ہوئے ہیں جو غیر قانونی ہیں اور قانون کے مطابق انھیں مسمار کرنا ضروری ہے۔ سرکاری حلقوں کی طرف سے یہ اعلان سامنے آیا ہے کہ غیر قانونی طور پر تعمیر کی گئی تمام مساجد اور مدارس کو شہید کر دیا جائے گا جبکہ دوسری طرف اسلام آباد اور راول پنڈی کی جمعیۃ اہل سنت اور اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان نے اس پر شدید احتجاج کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ مزید مساجد کو شہید نہیں کرنے دیا جائے گا بلکہ مسمار کی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے گا۔ ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ جہاں ایک بار مسجد تعمیر ہو جائے، وہ قیامت تک مسجد ہوتی ہے اور اسے کسی صورت میں نہیں گرایا جا سکتا۔ اس مہم میں سب سے زیادہ فعال کردار حضرت مولانا محمد عبداللہ شہید کے قائم کردہ مدرسہ جامعہ حفصہ للبنات کی طالبات ادا کر رہی ہیں جنھوں نے جامعہ حفصہ کے قریب ایک سرکاری لائبریری پر احتجاج طور پر قبضہ کر رکھا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ جب تک حکومت مساجد و مدارس کو گرانے کا نوٹس واپس نہیں لیتی، تب تک وہ اس قبضہ سے دست بردار نہیں ہوں گی۔

سرکاری حلقوں کی طرف سے اخبارات میں ایک موقف یہ بھی سامنے آیا ہے کہ جو مدارس و مساجد اسلام آباد کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے مین راستے میں ہیں اور وفاقی دار الحکومت میں آنے

والے معزز غیر ملکی مہمانوں کی گزرگاہ میں ہیں، وہ ان کے نزدیک سکیورٹی رسک ہیں جہاں سے کسی بھی وقت کسی بھی قسم کی کارروائی ہوسکتی ہے، اس لیے سکیورٹی کے نقطہ نظر سے بھی ان مدارس ومساجد کا راستے سے ہٹایا جانا ضروری ہے۔ جامعہ حفصہ للبنات کی طالبات نے کچھ عرصہ قبل پولیس کی مداخلت کے خلاف مزاحمت کا جو مظاہرہ کیا تھا اور پولیس کو ان طالبات کے مقابلے میں ملیوڈی تک پسپا ہونا پڑا تھا، وہ بات ابھی تک سرکاری ذہنوں میں تازہ ہے اور ہمارے خیال میں اسی کے ردعمل میں جامعہ حفصہ اور مختلف مساجد ومدارس کو حکومت کی نئی پالیسی کا ہدف قرار دے دیا گیا ہے۔

اس پر ملک بھر کے دینی مدارس کے تمام مکاتب فکر کے وفاقوں پر مشتمل مشترکہ فورم 'اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ'' نے مضبوط موقف اختیار کیا ہے اور نہ صرف یہ کہ مدارس کے نظام کے حوالے سے وفاقی وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق کے ساتھ اپنے پہلے سے طے شدہ مذاکرات میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہے بلکہ مساجد ومدارس کے تحفظ کے لیے ایک نئی مہم کا بھی آغاز کر دیا ہے اور حسب سابق اس سلسلے میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور تنظیم المدارس العربیہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی سب سے زیادہ متحرک اور سرگرم عمل ہیں اور اس مہم کو آگے بڑھانے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔

جہاں تک مساجد ومدارس کے غیر قانونی ہونے کا تعلق ہے، یہ بات بہرحال بحث طلب ہے۔ اس پر اس سے پہلے قومی سطح پر کئی بار بحث ہو چکی ہے اور حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ کسی جگہ پر جگہ کے مالک کی اجازت کے بغیر تعمیر کی جانے والی مسجد چونکہ شرعاً مسجد نہیں ہوتی، اس لیے حکومت کو ایسی مساجد کو گرانے کا حق حاصل ہے، چنانچہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مولانا مفتی منیب الرحمٰن نے بھی ایک حالیہ انٹرویو میں اس موقف کا اظہار کیا ہے کہ کسی شخص کی ذاتی یا حکومت کی سرکاری زمین پر بغیر اجازت بنائی جانے والی مسجد غیر قانونی اور غیر شرعی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ جب سرکاری زمین پر مسجد بنائی جاتی ہے تو متعلقہ محکمے اور اہل کار خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور جب کئی برس تک وہاں نمازیں ادا ہونے کے بعد اسے گرانے کی بات ہوتی ہے تو ایک طرح کی جذباتی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا مفتی منیب الرحمٰن صاحب ان مساجد کے غیر قانونی

اور غیر شرعی ہونے میں حکومت کے ساتھ متفق ہیں، البتہ انھیں جذباتی ماحول کی وجہ سے ان کے گرائے جانے پر اشکال ہے، مگر ہمیں مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے اس موقف سے اتفاق نہیں اور اس کے بارے میں ہم کچھ معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

جہاں تک کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر مسجد یا مدرسہ تعمیر کیے جانے کا تعلق ہے، ہم اس موقف سے متفق ہیں کہ وہ مسجد اور مدرسہ صرف غیر قانونی ہی نہیں بلکہ غیر شرعی بھی ہے اور زمین کے مالک کو حق حاصل ہے کہ وہ اس زمین کو واپس حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی معروف قانونی طریقہ اختیار کر کے اپنی زمین کا قبضہ حاصل کرے، کیونکہ اس کی زمین غصب کی گئی ہے اور غاصب کو اپنی مغصوب چیز واپس لینے کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن کیا سرکاری زمین کا حکم بھی یہی ہے؟ اس میں ہمیں کلام ہے، اس لیے کہ ایک اسلامی ریاست میں لوگوں کی ضروریات کے لیے مساجد کا تعمیر کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر کسی علاقے میں مسجد کی ضرورت ہے، لیکن حکومت وہاں مسجد کی تعمیر کے لیے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہی اور وہاں کے مسلمان باہمی تعاون کے ساتھ کسی موزوں سرکاری جگہ پر مسجد تعمیر کر لیتے ہیں تو ہماری طالب علمانہ رائے میں وہ اس دینی ضرورت کو پورا کرنے میں حکومت ہی کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ مسجد شرعاً مسجد بن جاتی ہے۔

پھر ایک اور حوالے سے بھی دیکھ لیا جائے کہ ایک ہے اجازت اور ایک ہے رضا مندی۔ دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور اس فرق کو ملحوظ رکھنا فقہی طور پر ضروری ہے۔ اجازت یہ ہے کہ اس جگہ مسجد تعمیر کرنے کے لیے باقاعدہ درخواست دی جائے اور اجازت ملنے کے بعد وہاں تعمیر کر لی جائے، اور رضا مندی یہ ہے کہ مسجد تعمیر کر لی گئی ہے اور متعلقہ محکموں اور مجاز اتھارٹی نے اس پر خاموشی اختیار کر کے اسے عملاً قبول کر لیا ہے۔ مولانا مفتی منیب الرحمن صاحب کو میں ایک فقہی جزئیہ کی طرف متوجہ کرنا چاہوں گا جسے ہمارے فقہا نے ''نکاح فضولی'' کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے کسی دوست سے پوچھے اور اس کے علم میں لائے بغیر اس کی طرف سے نمائندہ بن کر اس کا نکاح کسی خاتون سے کرا دیا ہے۔ جب نکاح ہو رہا ہے تو جس کا نکاح کیا جا رہا ہے، اسے سرے سے

اس کی کوئی خبر ہی نہیں ہے، لیکن اس کا کوئی دوست اس کی اجازت اور مرضی معلوم کیے بغیر اس کا نکاح کرا رہا ہے۔ فقہاے کرام لکھتے ہیں کہ یہ نکاح اگر متعلقہ شخص نے بعد میں قبول کر لیا ہے اور اس عورت کے ساتھ میاں بیوی کا تعلق اختیار کر لیا ہے تو شرعاً یہ نکاح منعقد ہو جائے گا، وہ دونوں میاں بیوی متصور ہوں گے اور نکاح وغیرہ کے تمام شرعی احکام ان پر لاگو ہوں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کسی محلّہ کے مسلمانوں نے مسجد کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی موزوں اور مناسب سرکاری زمین پر مسجد تعمیر کر لی ہے اور مجاز اتھارٹی نے اس پر خاموشی اختیار کر لی ہے تو یہ ''رضامندی'' کے مترادف ہے اور اس عملی رضامندی کے بغیر حکومت کو وہ مسجد گرانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ پھر اس رضامندی کا مدار صرف خاموشی پر نہیں ہے بلکہ سالہا سال تک وہاں نمازیں ادا کی جاتی رہی ہیں جبکہ بجلی، پانی، گیس اور دیگر ضروری چیزوں کے کنکشنز کی منظوری اور متعلقہ محکموں اور مجاز اتھارٹی کے لوگوں کا اس مسجد میں نمازیں ادا کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ سالہا سال تک بطور مسجد ڈیل کرنا ''خاموش رضامندی'' سے بہت آگے کے امور ہیں اور یہ صرف رضامندی نہیں بلکہ عملاً اجازت کے مترادف ہیں۔

علاوہ ازیں ان مساجد و مدارس کو مسمار کرنے کی اس کارروائی کو اس موقع پر قانون اور شرعی حیثیت کے حوالے سے پیش کرنا بھی ہمارے نزدیک فریب کاری سے کم نہیں ہے، اس لیے کہ اگر بات صرف قانون کی عمل داری یا شرعی حیثیت کی پاس داری کی ہوتی تو اس کا نشانہ صرف مساجد نہ بنتیں بلکہ اسلام آباد میں غیر قانونی قبضوں کی باقی صورتیں بھی اس میں شامل ہوتیں اور کسی بھی عنوان سے سرکاری اراضی پر بغیر اجازت تعمیر کی جانے والی تمام عمارتوں کے خلاف اجتماعی آپریشن کا فیصلہ ہوتا۔ باقی تمام غیر قانونی قبضوں کو نظر انداز کر کے صرف مساجد کے خلاف آپریشن اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اصل ہدف ''لاقانونیت'' نہیں بلکہ ''مسجد'' ہے اور اسلام آباد کے حکمران دنیا کو اپنے سیکولر ہونے کا یقین دلانے کے لیے مساجد کے خلاف آپریشن کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس صورت میں یہ مسئلہ مساجد کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کا نہیں رہتا بلکہ مساجد کے تقدس اور ان کے معاشرتی کردار کے تحفظ کا بن جاتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ اور جمعیۃ اہل سنت اسلام

آبادنے اس سلسلے میں جوموقف اختیار کیا ہے، وہ معروضی تناظر میں صحیح موقف ہے جس کی تمام اہل دین کوحمایت کرنی چاہیے۔

(روزنامہ اسلام،؟؟؟)

نفاذ شریعت کے لیے جامعہ حفصہ کا اقدام

۲۰ فروری کو راولپنڈی پہنچ کر سواں کیمپ کے ''ہمراہی ٹریول'' کے اڈے سے جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر کے لیے ٹیکسی پر جا رہا تھا کہ گوجرانوالہ سے ہمارے ایک صحافی دوست طاہر قیوم چودھری نے موبائل فون پر بتایا کہ محترمہ ظل ہما عثمان کو کھلی کچہری کے دوران میں گولی مار دی گئی ہے اور انہیں انتہائی نازک حالت میں لاہور لے جایا گیا ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ خبر نہ ملی۔ بہت پریشانی ہوئی اور اسی پریشانی کے عالم میں جامعہ اسلامیہ پہنچا جہاں مولانا قاری سعید الرحمٰن اور دیگر احباب منتظر تھے۔ ان کے ساتھ جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات کی طرف سے سرکاری لائبریری پر قبضے کے تسلسل سے پیدا ہونے والی صورت حال پر گفتگو کے لیے میں نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔

جامعہ حفصہ للبنات اسلام آباد کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب مولانا عبد اللہ شہید کا قائم کردہ طالبات کا دینی مدرسہ ہے جہاں کم وبیش چھ ہزار کے لگ بھگ طالبات درس نظامی کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اس حوالے سے یہ طالبات کے مدارس میں ملک کا سب سے بڑا مدرسہ شمار ہوتا ہے جس کے مہتمم مولانا عبد اللہ شہید کے فرزند و جانشین مولانا عبد العزیز ہیں جو اپنے بھائی مولانا عبد الرشید غازی کے ساتھ مل کر جامعہ حفصہ کے ساتھ ساتھ اسلام آباد کے ایک اور بڑے دینی مدرسے جامعہ فریدیہ کا انتظام بھی چلا رہے ہیں۔ ان بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے تحریکی ذوق بھی خوب عطا کر رکھا ہے اور اس پس منظر میں وہ مختلف مواقع پر آزمائش کا سامنا بھی کر چکے ہیں۔ ان کی تمنا اور آرزو یہ ہے کہ پاکستان میں جس قدر جلد ممکن ہو، اسلامی نظام مکمل طور پر نافذ ہو جائے اور اس کے لیے وہ ہمہ وقت کسی بھی آزمائش کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

کم وبیش ایک ماہ قبل اسلام آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے مسجد امیر حمزہ کو غیر قانونی قرار دے کر شہید کر دیا اور ایک دوسری مسجد کی شہادت کی کارروائی شروع کی، جبکہ بعض دیگر مساجد کو مسمار کرنے کے نوٹس بھی جاری کیے گئے۔ اس پر راولپنڈی اور اسلام آباد کے علمائے کرام نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور مسجد گرائے جانے کے دوسرے روز سینکڑوں علمائے کرام مسجد امیر حمزہ کے ملبے پر جمع ہو گئے، وہاں ملبے پر نماز باجماعت ادا کی اور مسجد کو دوبارہ تعمیر نو کرنے کے لیے آپس میں چندہ کر کے تعمیر نو کا اعلان کر دیا۔ ان علمائے کرام کا موقف یہ تھا کہ یہ مسجد قدیم دور سے چلی آ رہی ہے اور اسے غیر قانونی قرار دینے کے بارے میں کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا موقف درست نہیں ہے، اس لیے شرعاً اس مسجد کی اسی جگہ دوبارہ تعمیر ضروری ہے، چنانچہ انہوں نے سی ڈی اے کے اقدام کو مسترد کرتے ہوئے مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس پر سی ڈی اے اور علمائے کرام کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا، مگر اسی دوران میں جامعہ حفصہ کی طالبات نے مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے ساتھ واقع ایک سرکاری لائبریری پر، جو بچوں کے لیے ایک عرصہ سے قائم ہے، قبضہ کر لیا اور مولانا عبد العزیز کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ یہ قبضہ اجتماعی طور پر کیا گیا ہے اور جب تک گرائی جانے والی مسجد دوبارہ تعمیر نہیں کی جاتی اور جن دیگر مساجد کو گرانے کے نوٹس دیے گئے ہیں، وہ واپس نہیں لیے جاتے، چلڈرن لائبریری کا قبضہ واگزار نہیں کیا جائے گا۔

نوجوان باپردہ طالبات کی ڈنڈا بردار فورس نے لائبریری کا کنٹرول سنبھال لیا اور اسے آمد و رفت کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس پر حکومتی حلقے اور اعلیٰ انتظامی افسران بھی حرکت میں آئے اور بظاہر یہ صورت نظر آنے لگی کہ حکومت بہر حال اس قبضے کو ختم کرانے کے لیے اقدام کرے گی، جبکہ اس کی مزاحمت طالبات کی طرف سے ہوگی جو ہزاروں کی تعداد میں جامعہ حفصہ کے ہاسٹل میں موجود ہیں، اس طرح تصادم کی ایک افسوس ناک صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ طالبات کی طرف سے اپنے مطالبات میں اسلامی نظام کے مکمل اور فوری نفاذ کو شامل کرنے سے اس تحریک کو ملک گیر شکل مل گئی۔ مولانا عبد العزیز کی اپیل پر ملک کے مختلف حصوں سے دینی مدارس کے طلبہ اور دینی کارکنوں نے مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کا رخ کرنا شروع کیا اور ہزاروں افراد وہاں جمع ہو گئے۔

جہاں تک اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کے بارے میں جامعہ حفصہ کی طالبات کے موقف کا تعلق ہے اور اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے کی بات ہے، اس سے ملک بھر کے دینی حلقوں نے اصولی طور پر اتفاق کا اظہار کیا، لیکن وفاقی دارالحکومت میں سرکاری فورسز کے ساتھ دینی کارکنوں، طلبہ، بالخصوص طالبات کے تصادم کے جو امکانات واضح نظر آنے لگے تھے، ان سے ملک بھر میں پریشانی اور اضطراب کا پیدا ہونا بھی ایک فطری امر تھا۔ اسلام آباد اور راولپنڈی کے علمائے کرام نے حکومتی حلقوں سے مذاکرات کے ذریعے سے اس مسئلے کو حل کرانے کی مقدور بھر کوشش کی اور مساجد کی حد تک حکومت سے اپنا موقف منوانے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ مسجد امیر حمزہ کو دوبارہ تعمیر کرنے کا اعلان کر کے وفاقی وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق نے علمائے کرام اور پریس کی موجودگی میں اس کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا، جبکہ دیگر مساجد کے لیے سرکردہ علمائے کرام کے ساتھ انتظامیہ اور سی ڈی اے کے اشتراک سے ایک کمیٹی کے جناب محمد اعجاز الحق کے علاوہ وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ سے طویل مذکرات ہوئے اور سرکردہ علمائے کرام کے ایک وفد نے وزیر اعظم جناب شوکت عزیز سے بھی ملاقات کی۔ اس طرح اسلام آباد کی مساجد کی حد تک وہاں کے علمائے کرام کی منشا کے مطابق مسئلہ اصولی طور پر حل ہو گیا جو بلاشبہ جامعہ حفصہ کی طالبات کی جدوجہد کا ایک اچھا ثمر ہے۔

اس دوران میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی اعلیٰ قیادت اسلام آباد آئی اور مولانا سلیم اللہ خان، مولانا حسن جان، مولانا تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا قاری سعید الرحمٰن، مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ اور مولانا انوار الحق حقانی سمیت سرکردہ علمائے کرام نے اس مسئلے کو حل کرانے میں سرگرم کردار ادا کیا، لیکن اس سب کچھ کے باوجود مسئلے کے حل میں یہ رکاوٹ موجود رہی، جو تادم تحریر اب بھی موجود ہے، کہ جامعہ حفصہ کی طالبات نے دوسرے مطالبات کی منظوری تک، جن میں اسلامی نظام کا مکمل اور فوری نفاذ سرفہرست ہے، سرکاری لائبریری پر قبضہ واگزار کرنے سے انکار کر دیا، جبکہ مولانا عبدالعزیز اس بات پر مصر چلے آ رہے ہیں کہ ملک میں مکمل شرعی نظام کے نفاذ تک وہ اس ماحول کو ختم نہیں کریں گے جسے سنجیدہ حلقے سرکاری فورسز کے ساتھ دینی کارکنوں اور طالبات کے تصادم کے شدید خطرے کا باعث سمجھ رہے ہیں۔ یہ

بات ظاہر ہے کہ باشعور دینی حلقوں کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ اس پس منظر میں مولانا قاری سعید الرحمٰن کے پاس برادرم مولانا عبدالحق خان بشیر امیر پاکستان شریعت کونسل پنجاب، مولانا احسان اللہ فاروقی اور حاجی جمال دین کے ہمراہ حاضری ہوئی تاکہ صورت حال معلوم کر سکیں۔ مولانا قاری سعید الرحمٰن کے علاوہ ہم نے ان مذاکرات اور تگ ودو میں شریک ایک اور بزرگ مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی سے بھی ملاقات کی اور ان سے اس حوالے سے معلومات حاصل کیں۔

ان دونوں بزرگوں کے ساتھ ہم بھی اس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ جہاں تک اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے کا تعلق ہے، وہ ہم سب کا متفقہ مطالبہ ہے، بلکہ قیام پاکستان کا بنیادی مقصد ہے اور دستور پاکستان نے اس کی گارنٹی دے رکھی ہے۔ لیکن اس کے لیے قانون کو ہاتھ میں لینا اور سرکاری فورسز کے ساتھ تصادم کی صورت اختیار کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات اور انتظامیہ کو اس سلسلے میں حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، حضرت مولانا عبدالرزاق اسکندر اور حضرت مولانا شیر علی شاہ صاحب جیسے بزرگ اکابر کی اپیل قبول کرتے ہوئے سرکاری لائبریری کا قبضہ واگزار کر دینا چاہیے اور تصادم ومحاذ آرائی کا ماحول ختم کر کے مذاکرات اور عوامی جدوجہد کے ذریعے سے اس سلسلے میں مزید پیش رفت کرنی چاہیے، کیونکہ بہرحال حکمت ودانش کا تقاضا یہی ہے۔

اسی دوران میں یہ خبر ملی کہ گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والی خاتون صوبائی وزیر ظل ہما عثمان، جنہیں قاتلانہ حملے کے بعد لاہور لے جایا گیا تھا، جاں بحق ہو گئی ہیں اور ان کو قتل کرنے والا شخص پکڑا گیا ہے جس نے برملا طور پر یہ کہا ہے کہ اس نے خاتون صوبائی وزیر کو اس لیے قتل کیا ہے کہ وہ عورت کی حکمرانی کو جائز نہیں سمجھتا اور اس طرح بے پردہ پھرنے کو پسند نہیں کرتا، اس لیے اس نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سے اسلام آباد کے حالات سے ذہن میں پیدا ہونے والی تشویش دوچند ہو گئی کہ اسلام کے نام پر اور اسلام کے لیے ملک کے اندر اس طرح تصادم کا ماحول پیدا کرنے اور قوت استعمال کرنے کا رجحان ہمارے ہاں کیا کیا گل کھلا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس ملک اور قوم کی حفاظت کی دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

یہ صاحب اس سے قبل بدکاری کے الزام میں کئی عورتوں کو قتل کر چکے ہیں اور اس کا اعلان ہے کہ وہ آئندہ بھی اس طرح بے ہودہ عورتوں کو قتل کرتا رہے گا۔ اس طرز عمل کو جنون اور نفسیاتی مرض کے سوا کسی اور عنوان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے کسی طرح بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی شخص شریعت کے خلاف ہونے والے کسی عمل پر خود فیصلہ کرنے بیٹھ جائے اور ہتھیار اٹھا کر لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دے۔ احتجاج کی حد تک جذبات کے اظہار کے لیے معروف طریقے سے کوئی قدم اٹھانے کی بات الگ ہے کہ اس کی ہر مہذب ملک میں آج بھی گنجائش اور جواز موجود ہے، لیکن کسی کو جان کو خطرے میں ڈالنا، قتل کرنا، زخمی کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لے لینا کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ مرحومہ ظل ہما عثمان بے پردگی کی کس حد تک مرتکب تھیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور اس پر بحث کی گنجائش موجود ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس سے کہیں آگے کے مرحلے کے لیے ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو عین بدکاری کی حالت میں دیکھے تو کیا وہ اسے قتل نہیں کرے گا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایسی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور قانون کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔

بہر حال اسلام آباد میں اسلامی نظام کے لیے سرکاری فورسز کے ساتھ تصادم کا ماحول ہو یا گوجرانوالہ میں خاتون صوبائی وزیر کا بے پردگی کے عنوان سے قتل کا افسوسناک سانحہ ہو، اس انتہا پسندی پر افسوس کا اظہار ضروری ہے اور اسے روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب نفاذ اسلام کے تمام دستوری راستے بند کر دیے گئے ہوں، پیش رفت کے بجائے ''ریورس گیئر'' کا ماحول قائم کر دیا گیا اور مغربی ثقافت کے فروغ کے لیے تمام ریاستی وسائل استعمال ہو رہے ہوں، وہاں اس قسم کی افسوس ناک انتہا پسندی کو جنم لینے سے آخر روکا بھی کیسے جا سکتا ہے؟ یہی اہل دانش و بینش کے لیے غور طلب نکتہ ہے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۲۶ رفروری ۲۰۰۷)

جامعہ حفصہ کی طالبات کا احتجاج اور اعتدال کی راہ

اسلام آباد میں حکومت کی طرف سے گرائی جانے والی مساجد کا مسئلہ حکومت اور علما کے درمیان مذاکرات اور بظاہر ایک سمجھوتے تک پہنچ جانے کے باوجود زیادہ گھمبیر اور پریشان کن ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں تک مسجدوں کو گرانے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں اصولی موقف گزشتہ کالم میں ہم بیان کر چکے ہیں اور اب بھی اسی موقف پر قائم ہیں کہ اگر کسی مناسب اور موزوں سرکاری زمین پر علاقہ کے لوگوں نے اپنی ضرورت کے تحت مسجد بنا لی ہے اور مسجد بن جانے کے بعد سرکاری محکموں نے اپنی ڈیلنگ میں اسے مسجد کے طور پر قبول کر لیا ہے تو وہ شرعی مسجد بن گئی ہے اور بعد میں اسے گرانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق حکومت نے بھی کسی حد تک اس موقف کو قبول کر لیا ہے اور گرائی جانے والی مساجد کی تعمیر نو کے وعدہ کے ساتھ ایک علما کمیٹی بنا دی گئی ہے جو اس قسم کی مساجد کے حوالے سے فیصلہ کرے گی، مگر جامعہ حفصہ للبنات، مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کی طالبات اس فیصلے پر مطمئن نظر نہیں آتیں اور ان کے احتجاج کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق سرکاری فورسز کی نقل و حرکت اس علاقہ میں بڑھ رہی ہے اور جس سرکاری لائبریری پر طالبات نے قبضہ کر رکھا ہے، اسے واگزار کرانے کے لیے ایکشن کی تیاریاں جاری ہیں جس پر سارے ملک میں تشویش و اضطراب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور ملک کے مختلف حصوں سے احباب فون پر صورت حال کے بارے میں معلومات اور اس کے بارے میں رائے دریافت کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر قبل پنجاب کے ایک جنوبی ضلع سے احباب نے فون پر دریافت کیا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کا موقف کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ وفاق المدارس العربیہ

پاکستان کی مرکزی مجلس عاملہ نے اسلام آباد کے اجلاس کے بعد جو اعلامیہ جاری کیا ہے، میں اس سے پوری طرح متفق ہوں اور موجودہ معروضی صورت حال میں اسے ہی صحیح اور متوازن موقف سمجھتا ہوں جس کی ملک بھر کے علما کو تائید کرنی چاہیے اور کارکنوں کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ انہوں نے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کے بارے میں پوچھا کہ انہوں نے ملک بھر کے طلبہ کو اسلام آباد پہنچنے کے لیے کہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ وہ اپنی علالت اور شدید ضعف ونقاہت کے باعث اس پوزیشن میں ہی نہیں ہیں کہ اس قسم کی کوئی بات کر سکیں اور اگر ایسی کوئی بات ان سے منسوب کی گئی ہے تو وہ درست نہیں ہے۔

جہاں تک مساجد کے بارے میں موقف کی بات ہے، اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے اور پورا ملک اس سلسلے میں اس موقف کی حمایت میں ہے، لیکن طریق کار کے بارے میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت نے، جو ممتاز ترین علمی شخصیات اور بزرگوں پر مشتمل ہے، اس طریق کار کے کسی پہلو سے اختلاف کیا ہے تو وہ بلاوجہ اور بلاوزن نہیں ہے اور ہماری عزیز طالبات اور ان کے سرپرستوں کو اس کی اہمیت محسوس کرنی چاہیے۔ جامعہ حفصہ کی طالبات نے چلڈرن لائبریری کی سرکاری عمارت پر قبضہ کیا تو بہت سے دوسرے احباب کی طرح ہم بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ علامتی احتجاج کی ایک صورت ہے جو اختیار کی گئی ہے اور جہاں بات نوجوانوں کی ہو تو اس قسم کے علامتی احتجاج دنیا بھر میں ہوتے رہتے ہیں، اس لیے اس میں کوئی زیادہ حرج کی بات نہیں ہے، لیکن معاملہ اپنے اثرات اور نتائج کے حوالے سے علامتی احتجاج سے بڑھ کر سنجیدہ محاذ آرائی کی صورت اختیار کرتا دکھائی دے رہا ہے جو اس صورت میں کسی طرح بھی پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ایک طرف ہزاروں طالبات ہیں اور دوسری طرف سرکاری فورسز ہیں۔ مسئلہ طالبات کا نہ ہوتا اور صرف مرد اور طلبہ اس محاذ آرائی کا فریق ہوتے تو بھی یہ بات ہزار مرتبہ سوچنے کی تھی کہ اسلام آباد میں سرکاری فورسز کے ساتھ دینی حلقوں کی اس طرح کی محاذ آرائی، جس میں براہ راست تصادم کا خطرہ سامنے دکھائی دے رہا ہو، شرعاً اور عقلاً درست بھی ہے یا نہیں، لیکن یہاں تو سرکاری فورسز کے سامنے طالبات کھڑی ہیں اور دنیا بھر کے سامنے یہ منظر ہے کہ خدانخواستہ طالبات

اور سرکاری فورسز کے درمیان کسی معرکے کا آغاز ہونے والا ہے۔ مسئلہ مساجد کے تحفظ کا ہو یا اسلامی نظام کے نفاذ کا، اور معاملہ غیر اسلامی قوانین کے ختم کرنے کا ہو یا مساجد کے انہدام کے نوٹس واپس لینے کا، ان میں کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان مطالبات کی حمایت ہم سب کی دینی ذمہ داری ہے، لیکن اس کے لیے وفاقی حکومت نے سرکاری فورسز کے ساتھ براہ راست محاذ آرائی کی فضا قائم کرنے کی حمایت نہیں کی جا سکتی اور اس کے نتائج ومضمرات سے آنکھیں بند کر کے صرف مطالبات درست ہونے کی بنیاد پر اس کا ساتھ دینا حکمت ودانش کا تقاضا نہیں۔

ہمارے بزرگوں نے آزادی کی جنگ بھی مسلح ہو کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی تک لڑی تھی اور حضرت شیخ الہند کی زندگی میں انہی کے زیر سایہ عدم تشدد کو اپنی جنگ کا سب سے بڑا ہتھیار قرار دے دیا تھا۔ اس کے بعد جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار اسلام اور دیگر فورموں میں سے جس نے بھی آزادی کی جنگ لڑی، عدم تشدد کے ہتھیار سے لڑی ہے جبکہ پاکستان بننے کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی، حضرت مولانا مفتی محمود اور دیگر اکابرین نے اسلامی نظام کے نفاذ اور کفر کے نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے لیے جتنی جدوجہد کی ہے، اس کی بنیاد عدم تشدد پر رہی ہے اور حکمرانوں سے ہزار اختلافات کے باوجود نہ قانون کو ہاتھ میں لیا ہے اور نہ ہی ملک کے مروجہ سسٹم کو اس انداز سے چیلنج کیا ہے کہ اس میں ''خروج'' کے جراثیم دکھائی دینے لگیں۔

پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد ہمارے دینی فرائض میں سے ہے لیکن اس کے لیے ہمارے اکابر نے جو طریقہ کار طے کیا ہے، تمام تر سست روی اور پے در پے رکاوٹوں کے باوجود ابھی تک وہی طریقہ کار صحیح ہے کیونکہ اس کا فیصلہ فرد واحد نے نہیں کیا بلکہ تمام مکاتب فکر کے اکتیس اکابر علمائے کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات کی صورت میں کیا تھا اور اسے تبدیل کرنے کے لیے اسی درجہ کے اکابر علمائے کرام کا اسی طرح کا متفقہ فیصلہ ضروری ہے۔ اس لیے ہم پورے شرح صدر اور خلوص نیت کے ساتھ جامعہ حفصہ للبنات کی طالبات سے، جو ہماری ہی بچیاں ہیں، گزارش ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت کی اپیل کو نظر انداز نہ کریں اور اپنے بزرگوں کے

فیصلے کو قبول کرتے ہوئے پورے وقار اور تحمل کے ساتھ اپنی سابقہ پوزیشن پر واپس چلی جائیں۔ گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کرنے کا حکومتی اعلان اور اس مسئلہ میں علما کمیٹی کی تشکیل کی صورت میں اس حوالہ سے انھوں نے یہ جنگ جیت لی ہے اور وہ اپنے مشن میں کامیاب ہیں۔ باقی رہی بات ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبہ کی تو انہوں نے اس کے لیے عزم و استقلال کا مظاہرہ کر کے دنیا کو کامیابی کے ساتھ یہ پیغام دے دیا ہے کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کا مطالبہ صرف مردوں کا نہیں، عورتوں کا بھی ہے اور پاکستان کی عورتیں اپنے حقوق اور ناموس و عزت کا تحفظ اسلامی نظام میں ہی سمجھتی ہیں۔ ان کی اس جدوجہد سے نفاذ اسلام کی تحریک کو بلاشبہ تقویت حاصل ہوئی ہے اور نیا خون ملا ہے، اس لیے اس سے آگے کے معاملات وہ اگر اپنے بزرگوں کے حوالہ کر دیں تو ان کے لیے یہی صورت زیادہ باوقار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری عزیز بچیاں اپنے بزرگوں کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے ان کی سرپرستی اور دعاؤں میں اپنا حصہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیں گی۔

اس کے ساتھ ہی مسئلہ کے اس پہلو کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ملک میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کی قیادت کرنے والے دوستوں کے لیے بہر حال لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ صورت حال نے آخر یہ رخ کیسے اور کیوں اختیار کر لیا ہے کہ طلبہ اور طالبات میں اس قدر بے چینی اور اضطراب دیکھنے میں آ رہا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ بعض دوست یہ کہہ کر اس بات کو ٹالنے کی کوشش کریں کہ اس کے پیچھے خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہوگا اور پس پردہ کچھ عناصر ایسی صورت حال پیدا کرنے کی خواہش رکھتے ہوں گے کہ دینی حلقے سرکاری فورسز کے ساتھ محاذ آرائی اور ٹکراؤ کی پوزیشن میں آئیں تا کہ ان کے تصادم سے مستقبل کے نقشے کو ایک مخصوص رنگ دینے کی راہ ہموار کی جا سکے، مگر ہمارے نزدیک اس کا یہ پہلو زیادہ قابل غور ہے کہ دینی اقدار اور روایات کے تحفظ اور نفاذ اسلام کی جدوجہد کے حوالے سے نئی نسل موجودہ دینی قیادت سے مایوس ہوتی جا رہی ہے اور حالات جس انداز سے آگے بڑھ رہے ہیں، اس سے اس مایوسی میں اضافہ ہی کی توقع کی جاتی ہے۔ افغانستان اور عراق پر حملہ کے حوالے سے ہماری دینی قیادت کا ردعمل رسمی اور روایتی سے زیادہ نہیں تھا جبکہ حدود آرڈیننس میں ترامیم کو روکنے کے لیے بھی وہ کردار ادا نہیں کیا جا سکا جس کی نئی نسل کو توقع تھی اور مستقبل قریب

میں تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت کے قوانین کے خاتمہ کے لیے جن عزائم کا اظہار سرکاری حلقوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے، ان کے بارے میں کوئی موثر پیش رفت دیکھنے میں نہیں آ رہی۔ اس وجہ سے عام لوگ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ دینی حلقوں کی سیاسی قیادت کا طرز عمل یہی رہا تو حکومت کے لیے حدود آرڈیننس کی طرح دیگر اسلامی قوانین کے خاتمہ یا ان میں من مانی ترامیم کوئی مشکل کام نہیں رہے گا۔ یہ سنجیدہ سوال ہے جو طلبہ اور طالبات کی جدوجہد نے پوری شدت کے ساتھ اجاگر کر دیا ہے اور اگر ہماری دینی قیادت اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے پر تیار ہوگئی تو یہ ہماری ان بچیوں کی محنت اور قربانیوں کا مثبت اور مفید نتیجہ ثابت ہوگا۔

(روزنامہ اسلام لاہور، ۱۲ر فروری ۲۰۰۷)

جامعہ حفصہ کی طالبات کی جدوجہد۔ چند سوالات

جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات کے مطالبات اور جدوجہد کے حوالے سے معاملات جس رخ پر آگے بڑھ رہے ہیں، اس سے کئی سنجیدہ سوالات نے جنم لیا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ بات اسلام آباد میں ایک مسجد کے گرائے جانے اور متعدد دیگر مساجد کو غیر قانونی قرار دے کر ان کے گرائے جانے کا نوٹس جاری ہونے پر بطور احتجاج شروع ہوئی تھی جس میں جامعہ حفصہ کی طالبات نے ایک سرکاری لائبریری پر احتجاجاً قبضہ کر لیا تھا۔ ان طالبات اور ان کے سرپرست مولانا عبدالعزیز اور مولانا غازی عبدالرشید کا، جو مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے سابق خطیب حضرت مولانا محمد عبداللہ شہیدؒ کے فرزند و جانشین ہیں، مطالبہ یہ تھا کہ گرائی جانے والی مسجد یا مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے اور دیگر مساجد کو گرانے کا نوٹس واپس لیا جائے۔ جامعہ حفصہ مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے ساتھ ملحق ہے اور اس میں ہزاروں طالبات نہ صرف دینی تعلیم حاصل کرتی ہیں بلکہ مستقل طور پر ہاسٹل میں قیام پذیر بھی ہیں اور اس سے قبل ایک موقع پر اسلام آباد پولیس کے ساتھ کھلے روڈ پر ان طالبات کی محاذ آرائی ہو چکی ہے جس میں پولیس کو پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ اس لیے طالبات کے اس احتجاج نے اوپر کی سطح تک ہلچل پیدا کر دی اور اعلیٰ حلقوں میں یہ سوچا گیا کہ طالبات کے خلاف قوت استعمال کرنے اور سختی کا ماحول قائم کرنے کے بجائے افہام و تفہیم سے کام لیا جائے اور مذاکرات کے ذریعے سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

جہاں تک مساجد کے گرائے جانے کا تعلق ہے، اس پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سربراہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان اور دیگر اکابر کی مساعی سے یہ حل نکل آیا کہ وفاقی حکومت نے

گرائی جانے والی مسجد کی دوبارہ تعمیر کا اعلان کر کے وفاقی وزیر مذہبی امور کے ہاتھوں اس کا سنگ بنیاد بھی رکھوا دیا اور دیگر مساجد کے بارے میں اسلام آباد کے سرکردہ علمائے کرام کے ساتھ ایک مشترکہ کمیٹی قائم کر کے ان کے بارے میں فیصلہ اس کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا، لیکن طالبات اور ان کے سرپرستوں نے اس کو قبول کرنے کے بجائے ملک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کے ساتھ دیگر بعض اور مطالبات بھی شامل کر کے اعلان کر دیا کہ جب تک یہ سارے مطالبات منظور نہیں ہو جاتے، ان کا احتجاج جاری رہے گا، حالانکہ ان کی مدد کے لیے اسلام آباد آنے والے اکابر علمائے کرام مولانا سلیم اللہ خان، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ، مولانا حسن جان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور دیگر حضرات نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ لائبریری کا قبضہ چھوڑ کر تصادم کا ماحول ختم کر دیں اور ان مطالبات کو، جو جائز مطالبات ہیں، حکومت سے منوانے کے لیے پرامن جدوجہد کا کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے۔

راقم الحروف نے بھی اس موقع پر مختلف احباب کے استفسار پر عرض کیا کہ ہم طالبات کے مطالبات کی حمایت کرتے ہیں اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے معروف اور پرامن ذرائع اختیار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے ہیں، لیکن اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت میں حکومت کے خلاف اس سطح کی محاذ آرائی کو شرعاً اور اخلاقاً درست نہیں سمجھتے جسے سیاسی زبان میں بغاوت یا شرعی اصطلاح میں خروج سے تعبیر کیا جا سکے، کیونکہ اس خروج کے لیے فقہائے کرام نے جو شرائط اور طریق کار بیان کیا ہے، وہ موجود نہیں ہے اور اس کے بغیر قانون کو ہاتھ میں لینے اور تصادم کی طرز کی محاذ آرائی کا راستہ اختیار کرنے کی حمایت نہیں کی جا سکتی، مگر جامعہ حفصہ کی طالبات اور ان کے سرپرستوں نے ان گزارشات پر توجہ دینے کے بجائے محاذ آرائی کا تسلسل قائم رکھنے کو ترجیح دی ہے اور تادم تحریر صورت حال یہ ہے کہ سرکاری لائبریری پر طالبات کا قبضہ برقرار ہے، ہزاروں طالبات ڈنڈوں سے مسلح ہو کر نہ صرف جامعہ کے اندر موجود ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً سڑکوں پر بھی آ رہی ہیں اور متعدد مواقع پر سرکاری فورسز کے ساتھ تصادم کی نوبت آ چکی ہے۔ اس دوران میں ایک واقعہ یہ بھی ہوا ہے کہ طالبات نے مبینہ طور پر فحاشی کے ایک اڈے سے چند خواتین کو پکڑا اور اپنے ساتھ لے

گئیں جس سے ان کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ انہیں سمجھا بجھا کر بدکاری کے عمل سے روکا جائے۔ بعد میں ان خواتین کو اگرچہ چھوڑ دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوال کھڑا ہو گیا ہے کہ کیا معاشرہ میں فحاشی یا دیگر منکرات کو روکنے کے لیے اس قسم کی کارروائی کی اجازت دی جا سکتی ہے؟

جہاں تک سوسائٹی میں معروفات کے فروغ اور منکرات کے سدِ باب کے لیے، جن میں بدکاری اور فحاشی سرفہرست ہیں، عوامی دباؤ یا جدوجہد کا تعلق ہے، یہ ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے اور قرآن وسنت میں سینکڑوں مقامات پر نہ صرف اس کا حکم دیا گیا ہے بلکہ اس سے گریز کو دینی تقاضوں سے انحراف قرار دیا گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک اسلامی حکومت کے فرائض میں بھی شامل ہے اور سوسائٹی کے ہر فرد کی انفرادی ذمہ داریوں میں بھی ایک اہم دینی ذمہ داری شمار ہوتی ہے، حتیٰ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جس معاشرہ میں نیکی کی تلقین اور برائی سے روکنے کی عمومی روایت ختم ہو جائے، وہ معاشرہ خدا کے عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی پوری سوسائٹی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، اس لیے جہاں تک اصولی طور پر لوگوں کو برائی سے روکنے کا تعلق ہے، اس کی اہمیت وضرورت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس ماحول میں جبکہ ریاست اور حکومت کے کم وبیش تمام ذرائع منکرات کے فروغ کے لیے بے دریغ استعمال ہو رہے ہیں اور سرکاری سطح پر معروفات کی حوصلہ شکنی اور منکرات کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کا ماحول بنتا جا رہا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عمل میں احتجاج اور شدت کا عنصر شامل ہونے کو بھی بے جواز نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس سب کے باوجود حکومت وقت کے ساتھ تصادم اور قانون کو ہاتھ میں لینے کا جواز موجود نہیں ہے اور اس پہلو سے بہر حال بچنے کی ضرورت ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ طالبات کا یہ غصہ بے جواز نہیں ہے اور یہ ردعمل ہے حکومتی اداروں کی طرف سے اسلامی احکام وقوانین کے نفاذ سے مسلسل گریز اور منکرات وفواحش کی سرپرستی کا جس پر غصہ آنا ایمان کی علامت ہے، اس لیے جہاں ہم اپنی عزیز بچیوں سے گزارش کر رہے ہیں کہ وہ تصادم کے راستے سے بچیں اور اپنے بزرگوں کا مشورہ تسلیم کرتے ہوئے اپنی اس جائز جدوجہد کے مستقبل کے معاملات ان کے سپرد کر دیں کہ اس میں خیر کا پہلو یہی ہے، وہاں حکومتی حلقوں سے یہ عرض کرنا بھی

ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کریں کہ یہ سب کچھ ان کی غلط پالیسیوں، اسلامی نظام و قوانین کے نفاذ سے ان کے مسلسل انحراف اور منکرات وفواحش کی ان کی طرف سے حوصلہ افزائی کا فطری ردعمل ہے جسے ختم کیے بغیر وہ اس کے ردعمل پر قابو پانے کی کسی کوشش میں بہر حال کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۸/اپریل ۲۰۰۷)

یہ راستہ شریعت کے مطابق نہیں

لال مسجد اسلام آباد کے حوالے سے درپیش مسئلہ زیادہ سنجیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف حکومتی حلقے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ اگر مفاہمت کا کوئی راستہ نہ نکلا تو آپریشن ناگزیر ہو جائے گا اور دوسری طرف لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز نے ملک بھر میں اپنے ہم خیال حضرات سے رابطے شروع کر دیے ہیں اور ان کی طرف سے مدارس کے طلبہ کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ اسلام آباد پہنچیں اور وہاں کی مختلف مساجد میں اعتکاف بیٹھیں جس سے ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اسلام آباد میں جمع کر کے حکومت پر دباؤ بڑھایا جائے تاکہ وہ ایکشن سے گریز کرے۔ آج اس سلسلہ میں ایک وفد نے مولانا عبدالعزیز کی طرف سے مجھ سے بھی ملاقات کی اور ایک عمومی خط کی کاپی مجھے دی جو ملک بھر کے علمائے کرام کے نام ہے۔ خط کا متن درج ذیل ہے:

''بخدمت جناب مولانا.................................... صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعد صد آداب وتسلیمات گزارش ہے کہ ہمارا ملک اسلام کے لیے لاکھوں انسانوں کی قربانیوں سے بنا تھا۔ ان ساٹھ سالوں میں علمائے کرام اور بزرگان دین اپنی بساط کے مطابق ملک میں اسلامی نظام لانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن جہاد کا راستہ اختیار نہ کرنے کی وجہ سے آج تک کماحقہ نتائج نہ مل سکے۔ اور آج ملک ڈاکہ، قتل وغارت گری، فحاشی وعریانی اور بدامنی کی لپیٹ میں ہے۔ ملک میں ۵ لاکھ سے زائد بدکاری کے اڈے ہیں جن میں ایک کروڑ سے زائد بہنوں کی یومیہ عصمت دری ہوتی ہے۔ شراب اور جوئے کے اڈے اس کے علاوہ ہیں۔ تو خدارا سوچیے ہمارے اس ملک کا کیا بنے گا؟ اگر ہم نے اب بھی موثر کردار ادا نہیں کیا اور جہاد کا راستہ اختیار نہ کیا تو کہیں اللہ کا عذاب نہ آ جائے۔

جامعہ فریدیہ کے طلبہ اور جامعہ سیدہ حفصہ کی طالبات نے اسلام آباد میں عرصہ ۱۳ سال سے قائم بدکاری کا اڈہ جس کو پولیس والے، سارے علاقہ والے جانتے ہیں اور سارے کرائم رپورٹرز کو معلوم ہے، ۱۹۹۸ء میں تھانہ آب پارہ میں اس پر مقدمہ بھی دائر ہوا اور بار بار محلّہ والے درخواستیں دیتے رہے، لیکن اس پر عمل نہ ہوا۔ اس اڈے میں یومیہ ۱۵۰ سے زائد مرد آتے تھے اور بہنوں کی عصمت دری کرتے تھے۔ طالبات ان عورتوں کو سمجھانے کے لیے اندر گئیں اور طلبہ باہر رہے۔ اس عورت نے طالبات کے سمجھانے پر دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ طالبات اس کو سمجھا کر واپس آ گئیں، لیکن پھر بھی وہ عورت اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ اس پر طالبات نے دوبارہ کارروائی کی اور ان عورتوں کو یہاں لایا گیا اور سمجھا کر توبہ کرنے پر چھوڑ دیا گیا۔ اس بات پر حکومت کو بہت غصہ ہے۔ حکومت، بدکاری کے اڈے چلانے والے اور ان کی سرپرستی کرنے والے سارے متحد ہو گئے ہیں کہ جامعہ حفصہ کے خلاف آپریشن ۱۴ اپریل کو ضرور کریں گے۔ باطل ایک بدکار عورت کے لیے اتنا حساس ہے تو ہم دین داروں کو بھی متحد ہو جانا چاہیے، اور ہم دین والے حق پر ہوتے ہوئے بھی نہ اٹھے تو قیامت کے دن اللہ اور اس کے رسول کو کیا جواب دیں گے؟

اس لیے طلبہ و دیگر حضرات بغیر اسلحہ کے اپنا بستر و خرچہ اور جماعت بڑی ہونے کی صورت میں ایک ایک لاٹھی بھی ساتھ لے کر پندرہ اور چالیس دنوں کے لیے جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کریں اور اسلام آباد کی مساجد میں اعتکاف کریں، تا کہ نفاذ شریعت کا کام تیز کر سکیں اور بدکاری کے اڈوں کے خلاف موثر کارروائی کر سکیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی التماس ہے کہ اگر راستہ میں روکا جاتا ہے یا لاٹھی چارج ہوتا ہے تو اس صورت میں کسی کی ذاتی املاک [کو نقصان پہنچانے] اور گھیراؤ جلاؤ کی اجازت نہیں۔ پولیس والوں سے تھوڑی بہت مزاحمت کر سکتے ہیں، لیکن اتنی مزاحمت نہیں کہ جس سے جان کو خطرہ ہو۔ اس کی نسبت ہم جیل جانا اختیار کریں اور وہاں جہاد کی فضا بنائیں۔

جو علما کہتے ہیں کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں، ان کے پاس بھی ان بدکاری کے اڈوں کو بند کرانے کے لیے کوئی موثر طریقہ نہیں۔ اسی طرح جو کہتے ہیں کہ جمہوری راستہ سے کام کرنا چاہیے، ان کے پاس بھی کوئی موثر طریقہ اور راستہ نہیں جس کو اختیار کرتے ہوئے ان بدکاری اور جوئے کے اڈوں کو بند کرایا جائے۔ ہم نے نفاذ اسلام اور جہاد کے لیے جامعہ فریدیہ میں ۱۵ / یوم کی چھٹیاں کی ہیں۔ آپ حضرات سے بھی گزارش ہے کہ اپنے مدارس میں کم سے کم ۵ دنوں کی چھٹیاں کریں تا کہ طلبہ اپنے علاقے میں محنت کر کے زیادہ سے زیادہ جماعتیں لے کر نفاذ اسلام کانفرنس

اور سہ روزہ اعتکاف میں شریک ہوسکیں۔
اس لیے تمام علمائے کرام سے گزارش ہے کہ آپ خود بھی فوری طور پر تشریف لائیں اور طلبہ کو بھی روانہ فرمائیں، لیکن وہ جو اپنا خرچہ اپنا بستر لا سکتے ہوں۔

(مولانا محمد عبد العزیز)''

میں نے ان سے گزارش کی کہ مجھے اس دعوت اور موقف سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے میں اس سلسلہ میں کوئی تعاون نہیں کرسکتا۔ ان کے اصرار پر میں نے عرض کیا کہ اپنا موقف تفصیل کے ساتھ اپنے کالم میں لکھ چکا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلام آباد کی مساجد کے تحفظ، منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر، ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ، معاشرہ میں فواحش ومنکرات کے سدِ باب اور مغرب کی عریاں ثقافت کے فروغ کی روک تھام کا تعلق ہے، ان مقاصد سے کسی ذی شعور مسلمان اور پاکستانی کو اختلاف نہیں ہوسکتا اور اس سلسلہ میں کوئی بھی معقول کوشش ہو تو اس کی حمایت وتعاون ہمارے فرائض میں شامل ہے بلکہ اس حوالہ سے معروف طریقوں سے احتجاج کے اظہار اور رائے عامہ کو منظّم کرنے کی جدوجہد کی اہمیت وافادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ ملک کے شہریوں کا دستوری اور جمہوری حق ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کریں اور احتجاج واضطراب کا ہر وہ طریقہ اختیار کریں جو ہمارے ہاں معمول اور روایت کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر قانون کو ہاتھ میں لینے، حکومت وقت کے ساتھ تصادم کا راستہ اختیار کرنے اور کوئی متوازی سسٹم قائم کرنے کی حمایت نہیں کی جاسکتی، کیونکہ یہ شرعاً خروج کہلاتا ہے جس کے لیے فقہائے کرام نے کڑی شرائط عائد کی ہیں، اس لیے لال مسجد کی طرف سے جدوجہد کا جو طریق کار طے کیا گیا ہے اور جو دائرہ اس خط میں بتایا گیا ہے، وہ قانوناً، اخلاقاً اور شرعاً درست نہیں ہے اور میری لال مسجد کے احباب سے گزارش ہے کہ وہ اس پر اصرار کرنے کے بجائے اپنے طریق کار پر نظر ثانی کریں کیونکہ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ اپنے مضمرات اور نتائج دونوں حوالوں سے اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے لیے فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہوگا۔

اس خط میں یہ کہا گیا ہے کہ ملک میں اسلامی نظام اس لیے نافذ نہیں ہو سکا کہ اس کے لیے

جہاد کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لال مسجد کے حضرات کے نزدیک ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جہاد کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتہائی خطرناک غلطی ہے جس کے نتائج کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں قیام پاکستان کے بعد تمام مکاتب فکر کے اکابر علمائے کرام نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زیر صدارت مشترکہ اجلاس میں اسلامی دستور کے ۲۲ نکات مرتب کر کے یہ فیصلہ بالکل آغاز ہی میں کر لیا تھا کہ پاکستان میں نفاذ اسلام دستور کے ذریعے سے ہوگا اور اس کے لیے جمہوری عمل کو ذریعہ بنایا جائے گا۔ یہ چند علما کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ یہ اس اصول پر پاکستان کے جمہور علمائے کرام کے اتفاق رائے اور اجماع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد اسی فیصلے کی بنیاد پر نفاذ اسلام کی جدوجہد دستوری اور جمہوری عمل کے ذریعے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی کے تناسب اور اس کے اسباب وعوامل کی بحث اپنی جگہ اہم ہے، لیکن کامیابی میں تاخیر یا رکاوٹوں کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایک اصولی اور متفقہ فیصلے کو نظر انداز بلکہ کراس کر کے کوئی جذباتی راستہ اختیار کر لیا جائے۔ میں لال مسجد کی موجودہ مہم کی قیادت کرنے والوں اور ان کی حمایت کرنے والوں سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ جذبات کی فضا سے باہر نکل کر زمینی حقائق اور معروضی صورت حال کے ادراک کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لیں کیونکہ ملک میں نفاذ اسلام کے لیے حکومت وقت کے خلاف جہاد کا اعلان شرعی اصطلاح میں ''خروج'' کہلاتا ہے جو نہ صرف ۳۱ علمائے کرام کے ۲۲ دستوری نکات سے انحراف ہے بلکہ ملک کی دینی جدوجہد کے گزشتہ ساٹھ سال کے اجتماعی تعامل کی نفی کے مترادف ہے جس کی کسی بھی شخص یا ادارے کو اجازت نہیں دی جا سکتی، اس لیے لال مسجد کے دوستوں کا ملک بھر کی علمی و دینی قیادت کے موقف اور مشورہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اس جذباتی موقف پر اصرار 'اعجاب کل ذی رای برایہ' کا مصداق ہے جسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ قرار دیا ہے اور اس فتنہ سے بہر حال علمائے کرام کو بچنا چاہیے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۱۴ اپریل ۲۰۰۷)

منکرات وفواحش کا فروغ اور ارباب دانش کی ذمہ داری

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دور میں تمام لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی اور دنیا کی مذہبی قیادت وسیادت سے نوازا تھا، لیکن پھر انھی کو ملعون ومغضوب قرار دے دیا اور سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۷۸، ۷۹ کے مطابق اس کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی کہ 'کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ'، وہ ایک دوسرے کو اس برائی سے روکتے نہیں تھے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں یہ بات بیان فرمائی ہے کہ سوسائٹی میں منکرات کے ارتکاب پر باہمی روک ٹوک کا باقی رہنا ضروری ہے، ورنہ پوری سوسائٹی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت اور عذاب کی مستحق قرار پاتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جس فریضہ کا قرآن مجید نے بار بار تذکرہ کیا ہے، وہ سوسائٹی میں نیکی کے فروغ اور برائی کی روک تھام کی یہی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج کی آیت ۴۱ میں مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری کے طور پر بیان فرمایا ہے اور سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۰ میں اسے امت کی عمومی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے، اس لیے معاشرہ میں نیکیوں کا فروغ اور برائیوں کی روک تھام جہاں حکومت کے فرائض کا حصہ ہے، وہاں عوام کے فرائض میں بھی شامل ہے اور سوسائٹی کے تمام طبقات درجہ بدرجہ اس بات کے لیے مسئول ہیں۔

جس طرح ایک انسانی جسم کے اندر فطری طور پر جو قوت مدافعت موجود ہوتی ہے، وہ اگر قائم رہے تو جسم بڑی سے بڑی بیماری کا مقابلہ کر لیتا ہے، لیکن اگر وہ قوت مدافعت مضمحل یا ختم ہو جائے تو چھوٹی سی بیماری سے نمٹنا بھی جسم کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، یہی مثال سوسائٹی میں برائیوں پر باہمی روک ٹوک کے نظام کی ہے۔ اگر معروفات کی باہمی تلقین اور منکرات پر باہمی روک ٹوک کا سسٹم

موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوسائٹی منکرات کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہے اور خود کو ان سے محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن اگر یہ سسٹم کمزور پڑ جائے تو سوسائٹی کی قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے اور سوسائٹی خود کو کسی برائی سے محفوظ رکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے، اور اگر کسی سوسائٹی میں نیکیوں کی باہمی تلقین اور برائیوں پر باہمی روک ٹوک کا سسٹم سرے سے ختم ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوسائٹی نے برائیوں کو اجتماعی طور پر قبول کر لیا ہے اور یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب کوئی قوم قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق خدائی لعنت اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول عمومی عذاب کی مستحق بن جاتی ہے۔

گزشتہ دنوں لال مسجد اسلام آباد کی انتظامیہ کے رضا کاروں نے مبینہ طور پر ایک قحبہ خانے پر چھاپہ مار کر وہاں کی انچارج خاتون کو حراست میں لے لیا اور ابھی چند روز قبل ایک مساج پارلر کے کارندوں کو حراست میں لینے کے بعد اسلام آباد انتظامیہ کی اس یقین دہانی پر انھیں آزاد کیا کہ اسلام آباد میں مساج پارلروں کو بند کر دیا جائے گا۔ اس پر ملک بھر میں یہ سوال کھڑا ہو گیا کہ کیا اس طرح پرائیویٹ طور پر احتساب کا نظام قائم کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لے کر برائی کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنا درست عمل ہے؟ ملک بھر کے سنجیدہ حلقوں نے اس طرز عمل سے اختلاف کیا اور ہم نے بھی واضح طور پر عرض کیا کہ حکومت وقت کے ساتھ تصادم کا ماحول پیدا کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لینا شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً کسی بھی لحاظ سے درست طرز عمل نہیں ہے اور لال مسجد کی انتظامیہ کو زود یا بدیر اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی، لیکن ہمارے خیال میں ابھی تک یہ بحث یک طرفہ طور پر چل رہی ہے اور معاملہ کے صرف ایک رخ پر مسلسل بات کی جا رہی ہے کہ برائیوں کی روک تھام کے لیے پرائیویٹ سطح پر کوئی کارروائی کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لینا درست نہیں ہے، جبکہ اس معاملے کے دوسرے رخ پر توجہ دینے سے ہمارے دانش ور ابھی تک کترا رہے ہیں کہ معاشرہ میں منکرات کی روک تھام آخر کس کی ذمہ داری ہے؟ خصوصاً جب صورت حال یہ ہو گئی ہو کہ حکومتی ادارے فحاشی اور منکرات کی روک تھام کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کے بجائے خود ان کے فروغ کا ذریعہ بن رہے ہوں، سیاسی اور دینی جماعتوں نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہو اور سماجی اداروں کے

ایجنڈے میں بھی یہ بات شامل نہ ہوتو کیا عملاً یہی صورت نہیں بن جاتی کہ سوسائٹی نے برائی کو اجتماعی طور پر قبول کرلیا ہے اوراس کا کوئی طبقہ برائی کی روک تھام کے لیے کوئی کردارادا کرنے کو تیار نہیں ہے؟ ہمارا یہ سوال ان طبقات اورارباب دانش سے ہے جوقرآن وسنت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے موجود تعلیمات سے آگاہ ہیں کہ کیا منکرات وفواحش کے مسلسل فروغ پر سوسائٹی کی اجتماعی خاموشی کی صورت حال کوقبول کرلیا جائے اورایسی صورت میں قرآن وسنت میں جووعیدیں وارد ہوئی ہیں، انھیں یکسر نظرانداز کردیا جائے؟ اور کیا ارشاد ربانی 'کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم' کا عملی منظر اسی طرح کا نہیں ہوتا؟

مساج پارلروں کا معاملہ ہی سامنے رکھ لیا جائے جن میں نوجوان اورنوعمر لڑکیاں مردوں کو مساج کرتی ہیں اور مساج کے نام پر بدکاری کا ایک وسیع نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں اس قسم کے بدکاری کے اڈوں کی موجودگی، ان کا فروغ اور ان پر حکومتی اداروں، دینی وسیاسی جماعتوں کی خاموشی اور سماجی اداروں کی لاتعلقی اور بےحسی کا ایک انتہائی افسوس ناک منظر سامنے ہے۔ اس صورت حال میں اگر ہمارے دانش ورصرف لال مسجد کی انتظامیہ کو ہی کوستے چلے جائیں کہ وہ غلط کر رہے ہیں، انھیں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے اور ازخود کسی کارروائی سے گریز کرنا چاہیے تو ہمارے نزدیک یہ بات صحیح ہونے کے باوجود ادھوری اور یک طرفہ ہے۔

لال مسجد کی انتظامیہ کے طریق کار کو ہم بھی غلط سمجھتے ہیں جس کا ہم نے برملا اظہار کیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ ردعمل ہے منکرات وفواحش کے مسلسل فروغ پر حکومتی اداروں، دینی وسیاسی جماعتوں اور سماجی اداروں کی مجرمانہ خاموشی اور بےحسی کا جومنکرات وفواحش ہی کی طرح پیہم بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ہم ارباب فکرودانش سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ لال مسجد کی انتظامیہ کواس کے غلط طریق کار پر ضرور ٹوکیں اور انھیں سمجھائیں کہ برائی کو روکنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارے دانش وروں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ قوم کو بتائیں کہ مسلم معاشرے کومنکرات

وفواحش سے پاک رکھنا کس طرح ممکن ہے اور برائیوں کی روک تھام کے لیے حکومتی اداروں، دینی وسیاسی جماعتوں اور سماجی اداروں کی ذمہ داری کیا ہے؟ ورنہ اگر برائیوں پر باہمی روک ٹوک کا نظام ختم ہونے پر بنی اسرائیل خدا تعالیٰ کی طرف سے لعنت کے مستحق ہو گئے تھے تو اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے ہمارے لیے کوئی استثنا موجود نہیں ہے کہ جس جرم پر اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل پر لعنت نازل فرمادی تھی، اسی جرم کے ارتکاب پر ہمیں وہ سزا نہیں دی جائے گی۔ اور پھر بات ''سزا دی جائے گی'' کی بھی نہیں ہے، ہم افراد سے لے کر قوم اور پوری ملت تک جس صورت حال سے دوچار ہو چکے ہیں، کیا اس کے بعد کسی اور لعنت کا انتظار باقی رہ گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں صورت حال کے صحیح ادراک کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یاالٰہ العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، جولائی ۲۰۰۷)

شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان

جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات اور مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے خطیب مولانا عبدالعزیز کی مسلسل تگ ودو کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے، اس پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم اس سے قبل اس مہم کے حوالے سے اس کالم میں معروضات پیش کر چکے ہیں اور گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل اس کا خلاصہ ایک بار پھر قارئین کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جہاں تک اسلام آباد کی مساجد کے تحفظ، ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ اور معاشرہ میں فواحش ومنکرات کے سد باب کے حوالے سے ان کے موقف اور مطالبات کا تعلق ہے تو ان سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہ ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے۔ نیز ان مطالبات کے حق میں معروف طریقوں سے احتجاج کرنے اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کی جدوجہد کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس حوالے سے حکومت کے ساتھ تصادم، قانون کو ہاتھ میں لینے یا متوازی نظام قائم کرنے کے طرز عمل سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ملک کے اکابر علمائے کرام نے جو موقف اختیار کیا ہے اور جس کا اظہار حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں کیا ہے، اصولی طور پر وہی موقف درست ہے اور تمام اہل دین کو اس کی حمایت وتائید کرنی چاہیے۔ البتہ مولانا عبدالعزیز کی طرف سے شرعی عدالت کے قیام کے اعلان کے بارے میں یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر مقصد یہی تھا تو اس کے لیے سلیقے کے ساتھ ایسی پیش رفت کی جا سکتی تھی کہ جو خرابیاں اب تک سامنے آ چکی ہیں، ان سے بچتے ہوئے مثبت انداز میں اس جائز مقصد کے لیے رائے عامہ کو تیار کر لیا جائے، اس لیے کہ حکومتی نظام سے ہٹ کر پرائیویٹ سطح پر شرعی عدالتوں کا تصور ہمارے ہاں

نہ صرف پہلے سے موجود ہے بلکہ اس کے لیے خاصا کام اس سے قبل ہو چکا ہے۔

برصغیر میں فرنگی تسلط کے دور میں صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کے عنوان سے ایک نظام قائم ہوا تھا جس کے تحت مسلمان قاضی صاحبان شرعی عدالتوں کی صورت میں بعض معاملات میں مسلمانوں کے تنازعات ومقدمات کا فیصلہ کرتے آرہے ہیں اور یہ سلسلہ آزادی کے بعد بھی بدستور قائم ہے۔ ماضی قریب میں ہمارے محترم ومخدوم بزرگ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمہ اللہ تعالیٰ اس عدالتی نظام کی سربراہی کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں جبکہ کچھ عرصہ قبل بھارت کے بہت سے دیگر شہروں میں بھی اس طرز کی پنچایتی شرعی عدالتوں کے نظام کو توسیع دی گئی تھی اور ہماری معلومات کے مطابق درجنوں بھارتی شہروں میں یہ پرائیویٹ عدالتی نظام کام کر رہا ہے۔

اس طرز کا پرائیویٹ عدالتی نظام امریکہ میں بھی موجود ہے۔ امریکی دستور میں یہودیوں کے لیے یہ سہولت رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے خاندانی اور مالیاتی تنازعات ومعاملات کے فیصلوں کے لیے الگ عدالتی نظام قائم کر سکتے ہیں جس کے لیے دستور کے مطابق باقاعدہ منظوری دی جاتی ہے اور متعلقہ امور میں ان عدالتوں کے فیصلوں کا سپریم کورٹ تک میں احترام کیا جاتا ہے۔ یہودیوں نے اس حوالے سے اپنا علیحدہ عدالتی نظام قائم کر رکھا ہے جبکہ اسی گنجائش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں نے بھی اپنے خاندانی تنازعات کے تصفیہ کے لیے شرعی عدالتوں کے قیام کی طرف پیش رفت کی ہے اور شکاگو اور نیویارک سمیت بہت سے امریکی شہروں میں اس طرز کی عدالتیں مصروف عمل ہیں۔ دو سال قبل میں نے خود نیویارک میں ایک شرعی عدالت دیکھی جہاں ہمارے چند فاضل علمائے کرام اس نظام کے تحت فیصلے کر رہے ہیں۔ ان میں ہمارے گوجرانوالہ کے ایک پرانے فاضل دوست مولانا اعجاز احمد بھی ہیں جو مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور میں نے انہیں ایک مسلمان جوڑے کے باہمی تنازعہ کا فیصلہ کرتے ہوئے خود دیکھا۔

اب سے کوئی تیس برس قبل پاکستان میں جمعیت علمائے اسلام نے شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے آخری دنوں میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں جمعیت علمائے اسلام کا ملک گیر کنونشن تھا جس میں حضرت مولانا عبداللہ درخواستی کی زیر صدارت اس کنونشن کی

آخری نشست میں حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز نے جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق اعلان کیا تھا کہ ملک بھر میں جمعیت علماے اسلام کے زیر اہتمام ہر سطح پر پرائیویٹ شرعی عدالتیں قائم کی جائیں گی جو پنچایتی عدالتوں کی طرز پر لوگوں کے تنازعات ومقدمات کے فیصلے کریں گی۔ اس مقصد کے لیے وفاقی سطح پر حضرت مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ، حضرت مولانا عبدالکریم قریشی رحمہ اللہ آف لاڑکانہ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم پر مشتمل تین رکنی وفاقی عدالتی بنچ قائم کیا گیا تھا اور اس کے بعد جامعہ مدنیہ لاہور میں ممتاز فقہا اور علماے کرام پر مشتمل ایک مشاورتی اجتماع منعقد کر کے اس عدالتی نظام کے لیے باقاعدہ قواعد وضوابط اور طریق کار کا تعین کیا گیا تھا جس میں حضرت مولانا سید حامد میاں قدس اللہ سرہ العزیز اور حضرت مولانا محمد یوسف خان دامت برکاتہم آف پلندری آزاد کشمیر نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء کے بعد جمعیت علماے اسلام کا جو دستور شائع ہوا تھا، اس کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر ان عدالتی قواعد وضوابط اور طریق کار کو بھی دستور کا حصہ بنا کر شائع کیا گیا تھا، لیکن بعد میں کچھ انتظامی کمزوریوں اور پھر ۱۹۷۷ء کی سیاسی تحریک اور انتخابات کے ہنگاموں کے باعث یہ مہم آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ الغرض پرائیویٹ شرعی عدالتوں کا تصور نیا نہیں ہے اور نہ ہی ناقابل عمل ہے، لیکن اس کے لیے مولانا عبدالعزیز اور ان کے رفقا نے جو طریق کار اختیار کیا ہے، وہ درست نہیں ہے اس لیے ان شرعی عدالتوں کا معاملہ بھی مشکوک اور متنازعہ ہو کر رہ گیا ہے۔

یہ شرعی عدالت اگر ملکی دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے قائم ہو اور ملک کے اکابر اہل علم کی مشاورت اور ان کا اعتماد اس کی پشت پر ہو تو اس کی اہمیت وافادیت سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا بلکہ ہم موجودہ حالات میں اس کی ضرورت ۱۹۷۵ء سے کہیں زیادہ محسوس کرتے ہیں اور اگر ملک کی دینی قیادت اس سلسلے میں کوئی مثبت اور موثر پیش رفت کر سکے تو ہمارے نزدیک یہ ملک وقوم کی خدمت ہوگی اور اس میں کوئی اشکال اور الجھن کا جواز بھی نہیں ہے، یہ اس لیے کہ اگر اس طرز کی عدالتیں امریکا اور بھارت میں موجود ہیں اور کام کر رہی ہیں تو پاکستان میں ایسی عدالتوں کے وجود اور کام پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے، لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مولانا عبدالعزیز اور ان کے

رفقا نے اس کے لیے نہ صرف حکومت وقت سے بلا وجہ محاذ آرائی اور تصادم کا راستہ اختیار کیا بلکہ اپنی دینی قیادت اور اکابر کی ہدایت و مشاورت سے انحراف کو بھی ضروری سمجھا جس نے اس ساری جدوجہد کو شکوک اور شبہات کے دھندلکوں کی نذر کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اب بھی وقت ہے کہ مولانا عبدالعزیز اور ان کے رفقا اپنے سابقہ رویے پر اپنے بزرگوں سے معذرت کرتے ہوئے معاملات کی باگ ڈور انہی بزرگوں کے ہاتھ میں دے دیں تو بگڑی ہوئی بات پھر بن سکتی ہے اور پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے ایک ایسے نظام کی طرف موثر پیش رفت ہو سکتی ہے جو ملک کی ضرورت بھی ہے اور اسلامی قوانین کی عمل داری کی منزل کی طرف مسلسل سفر میں ایک سنگ میل بھی ثابت ہوگا۔

(روزنامہ اسلام لاہور، ۱۰/ اپریل ۲۰۰۷)

شرعی عدالتوں کے قیام کا جواز

متحدہ قومی موومنٹ نے گزشتہ دنوں کراچی میں لال مسجد اسلام آباد کے اس اعلان کے خلاف ریلی نکالی ہے جس میں شرعی عدالت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے اور اس طرح الطاف بھائی نے شرعی احکام کی بالادستی اور نفاذ کے خلاف باقاعدہ مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ جہاں تک لال مسجد اسلام آباد کی قائم کردہ شرعی عدالت کا تعلق ہے، اس کے خدوخال ابھی تک واضح نہیں ہوئے اور نہ ہی اس کے طریقہ کار اور اس کے حدودِ عمل کا اعلان کیا گیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا سردست قبل از وقت ہوگا، اس لیے کہ یہ بات اس شرعی عدالت کے قواعد وضوابط اور حدود کار سے واضح ہوگی کہ وہ ملک کے عدالتی نظام کے خلاف ایک متوازی عدالت ہے جو خروج اور بغاوت کے دائرے کی چیز ہے یا کوئی پنچایتی طرز کا عدالتی سسٹم ہے جس کی دستور پاکستان بلکہ دنیا کے کسی بھی دستور میں گنجائش موجود ہوتی ہے۔ اگر یہ متوازی نظام ہے اور مروجہ عدالتی سسٹم کو چیلنج کرتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ ہم اس سے قبل واضح طور پر کہہ چکے ہیں کہ جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات اور لال مسجد اسلام آباد کی انتظامیہ کے مطالبات کی حمایت اور ان کے ساتھ دلی ہمدردی کے باوجود ہم ان کے اس طرز عمل کو شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً درست نہیں سمجھتے جسے حکومت کے ساتھ تصادم، قانون کو ہاتھ میں لینے اور جبر سے تعبیر کیا جا رہا ہے اور جس نے ملک بھر کے دینی حلقوں کو بھی اضطراب سے دوچار کر دیا ہے، لیکن اس پس منظر سے ہٹ کر دیکھا جائے تو شرعی عدالت کا قیام اصولی طور پر نہ تو دستور کے خلاف ہے اور نہ ہی کوئی ایسا جرم ہے جس کے خلاف ملک میں ریلیاں نکالنے کی نوبت آ جائے اور شرعی قوانین کی عملداری کے خلاف پروپیگنڈے کا بازار گرم

کر دیا جائے۔

الطاف بھائی مہاجر کہلانے پر فخر کرتے ہیں اور مہاجر قومیت کے نام سے سیاست کر رہے ہیں، اس لیے انہیں یہ بات معلوم ہوگی کہ شرعی عدالتیں ہندوستان میں اس وقت قائم ہوئی تھیں جب لندن اس خطے پر حکمرانی کر رہا تھا جہاں بیٹھ کر الطاف بھائی پاکستان میں حکمرانی قائم کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں بلکہ کسی حد تک کر بھی رہے ہیں۔ پنچایتی طرز کی پرائیویٹ شرعی عدالتوں کا سلسلہ صوبہ بہار سے شروع ہوا تھا جہاں امارت شرعیہ کے عنوان سے مسلمانوں کے خاندانی تنازعات کو قرآن وسنت کی روشنی میں نمٹانے کے عمل کا آغاز ہوا تھا اور بزرگ عالم دین قاضی سجاد صاحب کو امیر شریعت منتخب کر کے ایک باقاعدہ عدالتی سسٹم تشکیل دیا گیا تھا جو اب تک کام کر رہا ہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ان شرعی عدالتوں کی سربراہی کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق ہمارے فاضل دوست مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی سے تو ہماری نیازمندی بھی تھی۔ ان سے لندن میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں، وہ ورلڈ اسلامک فورم کی دعوت پر لندن تشریف لائے اور ہمارے مختلف پروگراموں میں شریک ہوئے۔ ان کی قائم کردہ فقہ اکیڈمی کا علمی وفقہی کام آج پورے جنوبی ایشیا کے علمی ودینی حلقوں کا قابل قدر اثاثہ ہے اور قاضی وجج کی حیثیت سے ان کے تجربات اور فیصلے اس شعبے کے افراد کے لیے سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔

صوبہ بہار سے ہٹ کر بھارت کے بہت سے شہروں میں اس طرز کی پرائیویٹ شرعی عدالتوں کا نظام موجود ہے جو پنچایت کے طریقے سے کام کر رہا ہے۔ نہ تو فرنگی اقتدار کے دور میں ان سے تعرض کیا گیا تھا اور نہ ہی بھارت کا موجودہ سیکولر دستور ان شرعی عدالتوں کے وجود اور کام کی راہ میں رکاوٹ ہے، بلکہ ہماری معلومات کے مطابق ایک مرحلے میں جمعیت علمائے ہند نے ملک گیر سطح پر اس طرح کی شرعی عدالتوں کا فیصلہ کر کے علمائے ہند کے ایک بڑے اجتماع میں جنوبی ایشیا کے ممتاز محدث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو کل ہند سطح پر امیر شریعت منتخب کیا تھا۔ ان کے بعد مولانا اسعد مدنی

اس منصب پر فائز رہے، اب حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ اس حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور ان کی نگرانی میں بھارت کے بیسیوں شہروں میں علمائے کرام کی شرعی عدالتیں مسلمانوں کے خاندانی معاملات اور تنازعات کے فیصلے کر رہی ہیں، اس لیے اگر الطاف بھائی کو پاکستان کے علما اور قانون دانوں پر اعتماد نہیں ہے تو بھارت کے ہندو قانون دانوں سے اس قسم کی شرعی عدالتوں کی دستوری حیثیت کے بارے میں دریافت کر لیں، انہیں ان کی ضرورت وافادیت کا اندازہ ہو جائے گا اور اگر انہیں اس کے لیے مغرب ہی کے کسی کے حوالے کی ضرورت ہے تو وہ بھی حاضر ہے اور وہ بھی مغرب کے کسی عام ملک کا نہیں، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی مہم کی قیادت کرنے والے امریکہ بہادر کا کہ اس طرح کی شرعی عدالتیں خود امریکہ میں بھی موجود ہیں اور کام کر رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں ۱۹۸۷ء میں پہلی بار امریکہ گیا تو مجھے بتایا گیا کہ امریکی دستور میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر کسی مذہبی کمیونٹی کے افراد اپنے خاندانی اور مالیاتی تنازعات کے لیے اپنے مذہبی احکام کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے پرائیویٹ عدالتی نظام قائم کرنا چاہیں تو وہ سپریم کورٹ آف امریکہ سے منظوری لے کر ایسا کر سکتے ہیں اور امریکہ کے یہودیوں نے عملاً ایسا کر رکھا ہے۔ ان کی الگ پرائیویٹ عدالتیں ہیں جو نہ صرف خاندانی تنازعات، بلکہ مالیاتی معاملات میں فیصلے کرتی ہیں اور ان کے فیصلوں کا سپریم کورٹ آف امریکہ میں احترام کیا جاتا ہے۔ میں نے بہت سے مسلم علما سے اس وقت گزارش کی، بلکہ شکاگو کے مسلم کمیونٹی سنٹر میں اس پر ایک باقاعدہ لیکچر بھی دیا کہ اگر امریکہ کا دستور اس بات کی گنجائش دیتا ہے تو اس سے مسلمانوں کو بھی فائدہ اٹھانا چاہیے اور دستوری مراحل پورے کر کے اپنی عدالتیں ضرور قائم کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد بھی متعدد مراحل میں دوستوں کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس حوالے سے بعض شہروں میں پیش رفت ہوئی ہے۔ شکاگو اور اٹلانٹا سمیت متعدد مقامات پر شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ گزشتہ سال میں امریکہ گیا تو نیویارک میں ایک شرعی عدالت کو خود دیکھنے کا موقع ملا جو اگرچہ اس وقت منظوری کے مراحل میں تھی، لیکن بعض علمائے کرام مسلمانوں کے خاندانی تنازعات کی سماعت کر کے فیصلے دے رہے تھے۔

الطاف بھائی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ خود پاکستان میں بھی اس سے قبل پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے قیام کی کوشش ہو چکی ہے جو کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور کامیاب ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے دستوری جواز کو کسی نے چیلنج کیا تھا، بلکہ انتظامی کمزوریوں اور دیگر وجوہ کی بنا پر وہ مہم آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ یہ بھٹو مرحوم کی حکومت کے دور عروج کی بات ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جمعیۃ علماے اسلام کا کل پاکستان علما کنونشن مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ہوا جس میں ملک بھر سے پانچ ہزار کے لگ بھگ جید علماے کرام نے شرکت کی۔ چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر کی بھرپور نمائندگی تھی۔ یہ اتنا بھرپور اور کامیاب کنونشن تھا کہ اس کے نتیجے میں پنجاب کی پی پی گورنمنٹ نے جامع مسجد نور اور اس کے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم کو انتقاماً اوقاف کی تحویل میں لینے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا تھا جس کے خلاف مزاحمت کی تحریک میں سینکڑوں علماے کرام اور دینی کارکنوں نے مسلسل چار ماہ تک گرفتاریاں پیش کیں۔ خود میں بھی ساڑھے تین ماہ کے لگ بھگ جیل میں رہا اور بالآخر بھٹو حکومت کو وہ نوٹیفکیشن واپس لینا پڑا تھا۔ اس کنونشن میں جو حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی کی زیر صدارت منعقد ہوا اور حضرت مولانا عبید اللہ انور اس کے صدر استقبالیہ تھے، قائد جمعیت حضرت مولانا مفتی محمود نے جمعیت علماے اسلام کی طرف سے ملک بھر میں ہر سطح پر شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے وفاقی سطح پر حضرت مولانا مفتی محمود کی سربراہی میں تین رکنی عدالتی بورڈ قائم کیا تھا، جس میں حضرت مولانا عبدالکریم قریشیؒ آف بیر شریف لاڑکانہ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم آف گوجرانوالہ شامل تھے۔ پنجاب میں حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہؒ آف ملتان کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا، جب کہ ہمارے گوجرانوالہ کے موجودہ ایم این اے حضرت مولانا قاضی حمید اللہ بھی اس وقت قاضی بنے تھے، کیونکہ انہیں ضلع گوجرانوالہ کے لیے قاضی مقرر کیا گیا تھا، ان کے نام کے ساتھ قاضی کا اضافہ اسی حوالے سے ہوا۔ اس سے قبل وہ قاضی نہیں کہلاتے تھے۔

ان عدالتوں کے لیے باقاعدہ قواعد وضوابط طے کیے گئے تھے، طریقہ کار وضع کیا گیا، بعض جگہ عدالتوں نے کام بھی کیا اور کچھ فیصلے بھی کیے۔ ان عدالتوں کے قواعد وضوابط کو جمعیت علماے اسلام

پاکستان کے دستور کا حصہ بنایا گیا اور ان کی ترتیب و تدوین میں حضرت مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا مفتی عبدالواحد رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور حضرت مولانا محمد یوسف خان دامت برکاتہم آف پلندری جیسے بزرگ علماے کرام نے حصہ لیا۔ ان عدالتوں کے قیام کی انتظامی ذمہ داریوں میں راقم الحروف بھی شریک تھا، لیکن اس کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ تحریک مسجد نور نے کم و بیش نصف سال مصروف رکھا، پھر ملکی سطح پر پاکستان قومی اتحاد تشکیل پایا جس کا سربراہ مولانا مفتی محمودؒ کو چن لیا گیا۔ الیکشن مہم اور پھر نظام مصطفیٰ کی تحریک، اس کے بعد مارشل لا اور پھر حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے واقعات اس تسلسل کے ساتھ پیش آئے کہ پرائیویٹ شرعی عدالتوں کا یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا، جب کہ میرے نزدیک یہ جمعیت علماے اسلام پاکستان کی موجودہ قیادت کے ذمہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے قرض کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر مولانا فضل الرحمٰن اور ان کے رفقاء حضرت مولانا مفتی صاحبؒ کے اس ورثے کی طرف توجہ دے سکیں تو یہ ان کی بہت بڑی قومی خدمت ہوگی۔

اس لیے لال مسجد اسلام آباد کی طرف سے شرعی عدالت کے قیام کے اعلان کو ہم اصولاً غلط نہیں سمجھتے، بشرطیکہ وہ دستور کے دائرے میں ہو اور اسے متوازی عدالتی سسٹم کی حیثیت نہ دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہم محترم الطاف حسین سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ شرعی عدالتوں کے قیام کے اعلان پر اس قدر سیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ملک و قوم دونوں کی ضرورت ہے اگر دستور و قانون کی حدود میں رہتے ہوئے اسے چلایا جائے تو اس سے عام آدمی کو تین فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک یہ کہ فوری اور سستا انصاف مہیا ہوگا اور دوسرا یہ کہ شرعی احکام کے مطابق فیصلہ ہونے پر روحانی سکون میسر ہوگا اور تیسرے نمبر پر خیر و برکات کا بھی حصول ہوگا۔ دستور کی بالادستی اور جمہوری عمل کے احترام میں ہم الطاف بھائی کے ساتھ ہیں، لیکن اس کے آڑ میں شرعی احکام کی عمل داری کی مخالفت اور سیکولر ایجنڈے کو آگے بڑھانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۲۰/اپریل ۲۰۰۷)

جامعہ حفصہ کی صورت حال اور وفاق المدارس کا اعلامیہ

گزشتہ روز وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں پہلی بار باضابطہ طور پر شرکت کا موقع ملا۔ اس سے قبل مختلف حوالوں سے وفاق کے اجلاسوں میں شریک ہوتا رہا ہوں لیکن اس میں باضابطگی نہیں تھی جبکہ چند روز قبل وفاق کے صدر حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم کی طرف سے مجھے مجلس عاملہ کا رکن نامزد کیے جانے کے بارے میں ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے بذریعہ خط اطلاع دی اور ساتھ ہی ۱۸، ۱۹ اپریل کو ملتان میں وفاق کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ بھی موصول ہوا تو مجھے اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوگئی۔

اجلاس کی کارروائی کی باضابطہ رپورٹ تو ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی طرف سے جاری ہو چکی ہوگی، البتہ مجھے اپنے تاثرات کے حوالے سے چند گزارشات قارئین کی خدمت میں پیش کرنا ہیں۔

مولانا سلیم اللہ خان، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا حسن جان اور مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی جیسے بزرگ علمائے کرام کی دوروزہ اجلاس میں مسلسل موجودگی اور زیر بحث معاملات میں گہری دلچسپی اطمینان کا باعث تھی کہ مجلس عاملہ جو فیصلے کرتی ہے، ان کے پیچھے علمی مشاورت اور اعتماد کی فضا موجود ہے۔

یہاں تک لکھ چکا ہوں کہ مجلس عاملہ کے اس اجلاس کی طرف سے جاری کردہ اعلامیہ کا متن موصول ہو گیا جو میرے نزدیک مکمل طور پر قارئین کے سامنے آنا ضروری ہے، اس لیے اسے پیش کر رہا ہوں۔ باقی تاثرات بعد میں پیش کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اعلامیہ جاری کردہ مجلس عاملہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

منعقدہ ۲۹ رربیع الاول وکیم ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ رمطابق ۱۸، ۱۹ راپریل ۲۰۰۷ء

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کا دو روزہ اجلاس منعقدہ ملتان بتاریخ ۱۸، ۱۹ راپریل ۲۰۰۷ء زیر صدارت شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم ملک کی عمومی دینی ومعاشرتی صورت حال پر گہری تشویش واضطراب کا اظہار کرتے ہوئے چند اہم امور کی طرف قومی اور دینی حلقوں کو توجہ دلانا اپنی ذمہ داری تصور کرتا ہے:

☆ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قیام مسلم امہ کے جداگانہ تشخص کی بنیاد پر اس مقصد کے لیے عمل میں لایا گیا تھا کہ قرآن وسنت کے اصول وضوابط اور احکام وقوانین کے ساتھ ایک مثالی ریاست اور معاشرہ کی تشکیل کی طرف پیش رفت کی جائے اور گزشتہ ساٹھ برس کے دوران اس سلسلے میں قرارداد مقاصد اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات کے ذریعہ دستوری ضمانت اور یقین دہانی کا بھی متعدد بار اہتمام کیا گیا، لیکن عملی طور پر پاکستانی قوم نہ صرف یہ کہ اب تک زیرو پوائنٹ پر کھڑی ہے بلکہ حکمران طبقات اور ریاستی ادارے ملک میں اسلامی اقدار وروایات کو کمزور کرنے اور دینی اثرات ونشانات کو مٹانے کی مذموم مہم میں مسلسل مصروف نظر آ رہے ہیں۔

☆ روشن خیالی کے عنوان سے اسلامی احکام اور دینی اقدار کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، میڈیا کے تمام ذرائع کو فحاشی، بے حیائی اور عریانی کے فروغ کے لیے بے دریغ استعمال کیا جا رہا ہے، غیر ملکی سرمایہ کے بل بوتے پر کام کرنے والی ہزاروں سیکولر این جی اوز کو معاشرہ میں فکری انتشار اور اخلاقی بے راہ روی پھیلانے کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے، عوام میں دینی حلقوں اور اسلام کی اصل نمایاں قوتوں کا اعتماد مجروح کرنے کے لیے ان کی کردارکشی کی جا رہی ہے، فحاشی اور بے حیائی کے مراکز کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے، حدود آرڈیننس میں من مانی ترامیم کر کے شرعی احکام میں تبدیلی کا دروازہ کھول دیا گیا ہے، تحفظ ختم نبوت، تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور شراب پر پابندی جیسے اہم شرعی قوانین میں تبدیلی کی راہ ہموار کی جا رہی ہے اور اس قسم کے بہت سے دیگر اقدامات کے ذریعے پاکستان کو سیکولر ملک بنانے کے ایجنڈے پر تیزی کے ساتھ کام آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

☆ ملک کے تعلیمی نظام کا قبلہ تبدیل کیا جا رہا ہے، عالمی سیکولر قوتوں کے ایما پر ریاستی تعلیمی نظام ونصاب کو دینی مواد واثرات سے محروم کرنے کے لیے مسلسل اقدامات کیے جا رہے ہیں، تعلیمی اداروں کو اسلامی ماحول اور تربیت مہیا کرنے کی بجائے مغرب کی بے حیا ثقافت کے فروغ کے مراکز میں تبدیل کیا جا رہا ہے، دینی مدارس کو کردار کشی، دباؤ اور مداخلت کی بے جا کوششوں کے ذریعے ان کے آزادانہ کردار سے محروم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور عالمی سطح پر پاکستان کو اسلام اور مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر پیش کرنے کی بجائے اسلام دشمن عالمی قوتوں کے آلہ کار کی حیثیت سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔

☆ حکومت اور سرکاری اداروں کے اس نوعیت کے کردار اور اقدامات کے باعث ملک میں شدید ردعمل کی ایسی صورتیں سامنے آنا شروع ہوگئی ہیں جو اگرچہ تمام محبّ وطن حلقوں کے لیے تشویش واضطراب کا باعث ہیں، لیکن یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ یہ اسلام اور اسلامی احکام و قوانین کے حوالے سے حکومتی طبقات اور ریاستی اداروں کے ساٹھ سالہ مسلسل منفی رویہ کا لازمی ردعمل ہے۔ عوام کے ایک حصے نے ملک کے اسلامی تشخص کے تحفظ اور دستور کے مطابق ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے سلسلہ میں حکومت اور حکومتی اداروں سے مکمل طور پر مایوس ہو کر مبینہ طور پر تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور وفاقی دارالحکومت اور قبائلی علاقوں سمیت متعدد مقامات پر قانون کو ہاتھ میں لینے کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔

☆ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ ملک میں اسلامی احکام وقوانین کی عمل داری، اسلامی اقدار وروایات کے فروغ اور منکرات وفواحش کے سدباب کے لیے پرامن اور دستوری جدوجہد پر یقین رکھتی ہے اور جدوجہد کے کسی ایسے طریقے کو درست تصور نہیں کرتی جس میں حکومت کے ساتھ براہ راست تصادم، عوام پر زبردستی، یا قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوئی شکل پائی جاتی ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتی ہے کہ ایسی تمام صورتیں دراصل ردعمل ہیں اس مسلسل حکومتی طرز عمل کا جس کے نتیجے میں بعض حلقے حکومت اور حکومتی اداروں سے مکمل طور پر مایوس ہو کر اسلامی معاشرت واقدار کے تحفظ کے لیے قانون کو ہاتھ میں لینے پر خود کو مجبور

سمجھ رہے ہیں، اس لیے یہ اجلاس قانون کو ہاتھ میں لینے اور اسلامی اقدار وروایات کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی تمام صورتوں سے لاتعلقی اور براءت کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل اور رویے پر نظرِ ثانی کرے اور ایک اسلامی حکومت کے لیے قرآن و سنت اور دستور پاکستان کی بیان کردہ ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے اپنی ان پالیسیوں کو فی الفور تبدیل کرے جو اس قسم کی صورت حال کا باعث بن رہی ہیں۔

☆ جامعہ حفصہ اسلام آباد کے لائبریری پر قبضہ کے حوالے سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ اپنے اس موقف کا اعادہ ضروری سمجھتی ہے کہ جہاں تک جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات اور لال مسجد کی انتظامیہ کے ان مطالبات کا تعلق ہے کہ:

۱۔ ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔

۲۔ اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کو فوری طور دوبارہ تعمیر کیا جائے۔

۳۔ بدکاری اور فواحش کے اڈے ختم کیے جائیں، اور

۴۔ نام نہاد تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کی خلاف اسلام دفعات منسوخ کی جائیں۔

تو یہ مطالبات نہ صرف درست اور ضروری ہیں بلکہ ملک کے عوام کے دل کی آواز ہیں اور دستور پاکستان کا ناگزیر تقاضا ہیں، اس لیے یہ اجلاس ان مطالبات کی مکمل حمایت کرتے ہوئے حکومت پر زور دیتا ہے کہ وہ اپنے اسلامی اور دستوری فرائض کی پاسداری کرتے ہوئے ان کی منظوری کا اعلان کرے اور ان پر عمل درآمد کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کرے، البتہ اس سلسلے میں جامعہ حفصہؓ اسلام آباد کی طالبات اور لال مسجد کے منتظمین نے جو طریق کار اختیار کیا ہے، اسے یہ اجلاس درست نہیں سمجھتا اور اس کے لیے نہ صرف وفاق المدارس العربیہ کی اعلیٰ قیادت خود اسلام آباد جا کر متعلقہ حضرات سے متعدد بار بات چیت کر چکی ہے بلکہ ''وفاق'' کے فیصلہ اور موقف سے انحراف کے باعث جامعہ حفصہ کا ''وفاق'' کے ساتھ الحاق بھی ختم کیا جا چکا ہے۔

☆ یہ اجلاس وفاق المدارس العربیہ کی اعلیٰ قیادت کے موقف اور فیصلہ سے جامعہ حفصہؓ اسلام آباد اور لال مسجد کے منتظمین کے اس انحراف کو افسوس ناک قرار دیتا ہے اور ان سے اپیل کرتا

ہے کہ وہ اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے ملک کی اعلیٰ ترین علمی و دینی قیادت کی سرپرستی میں واپس آ جائیں تا کہ اس مسئلہ کا کوئی باوقار اور نتیجہ خیز حل نکالا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اجلاس حکومت کو خبردار کرتا ہے کہ اس کی طرف سے جبر اور تشدد کی کوئی بھی کارروائی اس مسئلہ کو مزید بگاڑنے کا باعث بنے گی، اس لیے وہ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے اپنی پالیسیوں میں تبدیلی کا احساس کرتے ہوئے مذاکرات اور گفت وشنید کے ذریعے یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرے۔

☆ یہ اجلاس اس صورت حال پر بھی تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ جامعہ حفصہ اسلام آباد کے لائبریری پر قبضہ اور اس جیسے بعض دیگر واقعات کی آڑ میں بعض سیکولر عناصر نے ملک میں شرعی قوانین کے خلاف مہم کو تیز کر دیا ہے اور منفی بیانات اور ریلیوں کے ذریعے حالات کو بگاڑا جا رہا ہے جس سے دینی حلقوں اور سیکولر حلقوں کے درمیان منافرت بڑھانے اور خانہ جنگی کے حالات پیدا کرنے کی سازش کی بو آ رہی ہے، اس لیے یہ اجلاس ملک کے دینی اور قومی حلقوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس صورت حال کا نوٹس لیں اور قوم کو نظریاتی تقسیم اور خانہ جنگی کے خطرات سے بچانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

☆ یہ اجلاس ان اطلاعات کو اشتعال انگیز تصور کرتا ہے کہ اسلام آباد اور راولپنڈی کے دینی مدارس میں سرکاری اہل کاروں کی آمد ورفت میں اضافہ ہو گیا ہے اور چھان بین کے نام پر انہیں ہراساں کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو وفاق المدارس کے ساتھ حکومت کی اب تک کی بات چیت اور طے شدہ امور سے انحراف ہے، اسے فی الفور بند ہونا چاہیے۔

☆ وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کی نظر میں یہ افواہیں انتہائی افسوس ناک اور اضطراب انگیز ہیں کہ حکومت دینی مدارس کو اسلام آباد کی حدود سے باہر منتقل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو یہ دینی مدارس کے خلاف انتہائی معاندانہ کارروائی متصور ہو گی۔ اسلام آباد میں غیر ملکی سرمایے سے چلنے والی سینکڑوں این جی اوز اور پرائیویٹ تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ اس پس منظر میں دینی مدارس کے خلاف اس قسم کی کارروائی وفاقی دارالحکومت کے شہریوں کو دینی تعلیم کے حق سے محروم کرنے کی کارروائی ہو گی جسے قبول نہیں کیا جائے گا اور حکومت کو اس سلسلے میں شدید

عوامی ردِعمل اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

☆ یہ اجلاس جامعہ حفصہ اسلام آباد پر گزشتہ روز ہیلی کاپٹر کی نیچی پرواز اور مبینہ طور زہریلی گیس کے استعمال اور طالبات کی تصاویر اتارے جانے کی کارروائی کی شدید مذمت کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس طرح کی اشتعال انگیز کارروائیوں کی بجائے مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کو حل کیا جائے۔

(روزنامہ اسلام لاہور، ۲۲ر اپریل ۲۰۰۷ء)

جامعہ حفصہ کا مسئلہ اور دینی مدارس کا مستقبل

مولانا عبدالعزیز کی گرفتاری کے بعد لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا حکومت کے ساتھ تنازع ایک لحاظ سے اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے اور ان کے نائب مولانا عبدالرشید غازی کی طرف سے خود کو حکومت کے حوالے کرنے کی مشروط پیش کش نے حکومت کے ساتھ ان کی مسلح مزاحمت کے باقی ماندہ امکانات کو بھی ختم کر دیا ہے۔ جب ان دونوں بھائیوں نے چند ماہ قبل اپنے بعض مطالبات کے لیے محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا تھا، اس وقت ملک کے سنجیدہ دینی حلقوں اور ان کے خیر خواہوں کی طرف سے انھیں یہ کہہ دیا گیا تھا کہ حکومت کے ساتھ اس طرح کی محاذ آرائی کا طریقہ درست اور قابل عمل نہیں ہے، اس لیے وہ اسے ترک کر دیں اور ملک کی علمی و دینی قیادت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی مشاورت کے ساتھ اپنے مطالبات منوانے کے لیے جدوجہد کا طریق کار از سر نو طے کریں، لیکن انھوں نے کوئی بھی معقول بات ماننے کے بجائے خود اپنے طے کردہ طریق کار پر قائم رہنے کا اعلان کر دیا اور اس پر ڈٹے رہے جس کا منطقی نتیجہ یہی ہونا تھا جو سامنے آ چکا ہے کہ دو درجن کے لگ بھگ شہریوں کی ہلاکت اور ملٹری فورسز کے آپریشن کے بعد غازی برادران کی پسپائی کا تماشا پوری دنیا دیکھ رہی ہے۔

جہاں تک ان مطالبات کا تعلق ہے کہ اسلام آباد میں سرکاری طور پر گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے، ملک میں اسلامی نظام کا مکمل نفاذ عمل میں لایا جائے، فحاشی اور بدکاری کے مبینہ اڈے ختم کیے جائیں اور حدود آرڈیننس میں کی گئی حالیہ غیر شرعی ترامیم واپس لی جائیں تو ان میں سے کوئی مطالبہ بھی ایسا نہیں ہے جسے ناجائز کہا جا سکے بلکہ یہ خود دستور پاکستان کے اسلامی و نظریاتی

تقاضوں کو پورا کرنے کے مطالبات ہیں، لیکن اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا، اس سے ملک کے ہر ذی شعور شخص نے اختلاف کیا اور اسے غلط ٹھہرایا، اس لیے کہ ایک مسلم ملک میں مسلمان حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا، متوازی نظام قائم کرنے کی کوشش کرنا اور عام لوگوں کو از خود سزا دینے کا طریقہ اختیار کرنا کسی طرح بھی جائز عمل نہیں کہلا سکتا، لیکن نہ صرف یہ کہ اس پر اصرار کیا گیا بلکہ اسے ''جہاد'' قرار دیا گیا اور طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد کو اس مقصد کے لیے ڈھال بنایا گیا جس سے معاملہ بتدریج سنگین سے سنگین تر صورت اختیار کرتا چلا گیا۔

دوسری طرف حکومت نے لال مسجد کی انتظامیہ کے غلط طریق کار کی آڑ میں ان جائز مطالبات کو مسلسل نظر انداز کیا جن کی ملک کے دینی حلقے حمایت کر رہے ہیں اور اس مسئلے کو مذاکرات کے ذریعے سے حل کرنے کے بجائے اسے زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کی جس سے ملک کے سنجیدہ حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ یہ سارا معاملہ خود حکومت کا پیدا کردہ ہے اور حکومت اس سے نہ صرف ملک کے اندر سیاسی فوائد حاصل کر رہی ہے بلکہ اسے دنیا میں دینی مدارس کے بارے میں غلط تاثرات پھیلانے کا ذریعہ بھی بنایا جا رہا ہے۔

دینی مدارس کے بارے میں سالہا سال سے عالمی میڈیا اور ادارے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ان میں اسلحہ کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور یہ مبینہ طور پر دہشت گردی کے مراکز ہیں، لیکن دینی مدارس کے وفاقوں کی قیادت نے مسلسل محنت کے ساتھ اس تاثر کو زائل کیا اور عالمی رائے عامہ کو کسی حد تک یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی کہ جنوبی ایشیا کے یہ دینی مدارس صرف تعلیم اور نظریاتی وفکری تربیت تک محدود ہیں، ان میں نہ اسلحہ کی تربیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان میں اسلحہ موجود ہے۔ اس پر پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے بھی، جب وہ وزیر داخلہ تھے، مضبوط اسٹینڈ لیا اور واضح طور پر دنیا کو بتایا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں اسلحہ کی موجودگی اور اس کی ٹریننگ کے الزامات بے بنیاد اور خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت حال اب بھی یہی ہے اور جامعہ حفصہ کی طرز کے اکا دکا مدارس کے علاوہ ملک بھر کے ہزاروں دینی مدارس میں کوئی ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اسلحہ کی ٹریننگ یا اسلحہ کے استعمال کی ترغیب دی جاتی ہو، لیکن جامعہ حفصہ کی صورت حال

نے اس تاثر کو الٹ دیا اور لوگوں کو پاکستان کے وفاقی دارالحکومت کے ایک بڑے مدرسے میں نہ صرف طلبہ بلکہ طالبات کے ہاتھوں میں بھی اسلحہ دکھائی دینے لگا ہے۔

ہمارے نزدیک حکومت نے معاملے کو حد سے زیادہ طول دے کر دیگر سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ اس تاثر کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس پر چودھری شجاعت حسین کے ایک حالیہ بیان کو بطور شہادت پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کوششوں سے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے سے معاملات طے ہونے کے قریب پہنچ گئے تھے کہ کسی خفیہ ہاتھ نے معاملات کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض عناصر یہ منظر بہرصورت دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف ملک کی مسلح فورسز ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں ایک دینی مدرسے کے طلبہ اور طالبات ہتھیار اٹھائے مزاحمت کے لیے مورچہ زن ہیں، اور ایسا چاہنے والے عناصر اس مقصد میں بہرحال کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس افسوس ناک صورت حال کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر عائد ہوتی ہے۔ غازی برادران نے ایک غلط طریق کار پر بے جا اصرار کر کے جہاں ملک بھر کے دینی حلقوں کا اعتماد کھویا اور محاذ آرائی کو تصادم تک پہنچانے کا ذریعہ بنے تو دوسری طرف حکومت نے معاملات کو حد سے زیادہ طول دے کر اور مذاکرات کے لیے کوئی سنجیدہ صورت اختیار کرنے سے عمداً گریز کر کے معاملات کو یہاں تک پہنچا دیا۔ اب اس کے بعد کیا ہونے والا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف باتیں کہی جا رہی ہیں۔ مجھے گزشتہ روز ایک ذمہ دار عالم دین نے فون پر بتایا کہ اس افسوس ناک واقعہ کی آڑ میں حکومت، اسلام آباد میں موجود دینی مدارس کے خلاف کارروائی کا پروگرام بنا رہی ہے اور اس مبینہ تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہو سکتی ہے کہ سیکیورٹی کے نام پر ان دینی مدارس کو اسلام آباد کی حدود سے باہر منتقل کر دیا جائے۔ یہ تجویز کچھ عرصہ قبل سامنے آئی تھی جسے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت نے مسترد کر دیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کی دستوری اور قانونی دائرے میں بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔

موجودہ صورت حال میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے افسوس ناک واقعات کی آڑ میں ان

عالمی حلقوں کا دباؤ بھی بڑھ سکتا ہے جو حکومت پاکستان پر پورے ملک کے دینی مدارس کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے اور اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے نام پر ان کے الگ تعلیمی نظام کو سرکاری کنٹرول میں لینے کے لیے زور دے رہے ہیں۔ آج ہی ایک خبر نظر سے گزری ہے کہ حکومت نے ملک بھر کے دینی مدارس میں اسلحہ کی موجودگی کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کی ہدایات جاری کر دی ہیں، حالانکہ ملک کے دینی مدارس کا اس حوالے سے کئی بار سروے کیا جا چکا ہے اور ہر بار اس کی رپورٹ نفی میں آئی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ صورت حال میں جب کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معاملات ملک بھر کے دینی مدارس سے اسلحہ اور محاذ آرائی، دونوں حوالوں سے مختلف ہیں اور کئی ماہ تک دنیا یہ منظر دیکھ چکی ہے کہ اس معاملے میں اسلام آباد اور ملک کے دیگر حصوں کے دینی مدارس لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے ساتھ شریک اور معاون نہیں ہیں، اس کے باوجود اگر اس کی آڑ میں اسلام آباد کے دینی مدارس یا ملک بھر کے دینی مدارس کے بارے میں کوئی منفی طرزِ عمل اختیار کیا گیا تو یہ بعض حلقوں کے اس تاثر کو حقیقی ثابت کرنے کی کارروائی سمجھی جائے گی کہ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے جس کے ایک حصے میں کامیابی سے عمل درآمد کے بعد اب اس ایجنڈے کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۱۰ر جولائی ۲۰۰۷)

مذاکرات کی کہانی

اب جبکہ لال مسجد اسلام آباد، جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا معاملہ مسلح حکومتی آپریشن کے بعد اس انجام کو پہنچ چکا ہے جو ملک کی مقتدر قوتوں کی خواہش تھی اور جس کے لیے گن گن کر دن گزارے جا رہے تھے، اور اس وقت جب میں اسلام آباد ہی میں بیٹھا یہ سطور تحریر کر رہا ہوں، غازی عبدالرشید اپنی والدہ محترمہ اور دیگر بہت سے رفقا سمیت جام شہادت نوش کر چکے ہیں جبکہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف سرکاری فورسز کا آپریشن آخری مرحلہ میں ہے جس کے بارے میں توقع کی جا رہی ہے کہ چند گھنٹوں میں اپنے آخری نتیجے تک پہنچنے والا ہے جبکہ کل صبح آپریشن کے آغاز سے ہی الیکٹرانک میڈیا پر وفاقی وزرا اور دیگر سرکاری ترجمانوں کے بیانات اور وضاحتوں کی شکل میں یک طرفہ صورت حال بار بار پیش کی جا رہی ہے، میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ میں بھی ان مذاکرات کا حصہ رہا ہوں جن کے اچانک ختم ہو جانے کے بعد مسلح آپریشن کا آخری راؤنڈ شروع ہو گیا تھا اور وہ اب تک جاری ہے، ان مذاکرات کے مختلف مراحل کی تفصیل قارئین کے سامنے پیش کر دوں تاکہ وہ معاملہ کے وسیع تر تناظر میں یہ جائزہ لے سکیں کہ وہ مذاکرات کیوں ناکام ہوئے جن کے ختم ہوتے ہی سب کچھ ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

ان مذاکرات کی کہانی کا طویل پس منظر ہے اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے حوالے سے، جو دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والے ملک بھر کے کم و بیش بارہ ہزار دینی مدارس کی نمائندہ تنظیم ہے، ان مذاکرات کا قصہ اس وقت شروع ہوا جب جامعہ حفصہ لال مسجد اسلام آباد کی طالبات نے قریب ہی واقع ایک سرکاری چلڈرن لائبریری پر یہ کہتے ہوئے قبضہ کر لیا کہ یہ قبضہ اسلام آباد

میں مقامی حکومت کی طرف سے چند مساجد کو گرائے جانے کے خلاف احتجاج کے طور پر کیا گیا ہے اور مساجد کی دوبارہ تعمیر کی صورت میں یہ قبضہ چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ امور بھی مطالبات میں شامل تھے کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے، فحاشی اور بے حیائی کے مبینہ اڈوں کو ختم کیا جائے اور حدود شرعیہ میں ایک آرڈیننس کے ذریعے سے جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، وہ واپس لی جائیں۔

اس موقع پر اسلام آباد اور راولپنڈی کے سرکردہ علمائے کرام نے جہاں حکومت پر دباؤ ڈال کر اس سے وعدہ لیا کہ وہ ان مساجد کو دوبارہ تعمیر کرے گی جو اسلام آباد میں گزشتہ چند برسوں کے دوران میں گرائی گئی ہیں بلکہ ان میں سے ایک مسجد کی تعمیر دوبارہ شروع بھی کرادی گئی، وہاں ان علمائے کرام نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے منتظم مولانا عبدالعزیز اور ان کے معاون مولانا عبدالرشید غازی پر بھی زور دیا کہ وہ سرکاری لائبریری کا قبضہ چھوڑ دیں اور کسی بھی احتجاجی جدوجہد کے لیے قانونی طریق کار پر قناعت کرتے ہوئے قانون کو ہاتھ میں لینے سے گریز کریں۔ دونوں بھائیوں نے اسلام آباد اور راولپنڈی کے سرکردہ علمائے کرام کے اس موقف کو قبول نہ کیا تو چونکہ معاملہ ایک دینی مدرسہ کا تھا کہ جامعہ حفصہ کا شمار ملک کے طالبات کے بڑے مدارس میں ہوتا تھا اور اس کی طالبات نے سرکاری لائبریری پر قبضہ کیا تھا، اس لیے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی ہائی کمان سے رجوع کیا گیا کہ وہ مداخلت کرے اور اس قضیہ کو نمٹانے کے لیے کردار ادا کرے، چنانچہ وفاق المدارس کی طرف سے اس کے سربراہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور ان کے ہمراہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا حسن جان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور دیگر سرکردہ حضرات اسلام آباد تشریف لائے اور حکومت کے ذمہ دار حضرات سے ملاقات کر کے گرائی جانے والی مساجد کو فوری طور پر دوبارہ تعمیر کرنے کا مطالبہ کیا اور مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی سے ملاقات کر کے انہیں بتایا کہ سرکاری عمارت پر قبضہ کرنے، قانون کو ہاتھ میں لینے اور حکومت کے ساتھ تصادم پیدا کرنے کی پالیسی سے وفاق المدارس کی قیادت کو اتفاق نہیں ہے اور ملک بھر کے اکابر علمائے کرام اس طریق کار کو غلط سمجھتے ہیں، اس لیے وہ لائبریری کا قبضہ چھوڑ دیں اور

اپنے مطالبات کے لیے قانونی طریق کار اور ذرائع اختیار کریں، مگر مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی نے یہ بات قبول نہ کی اور اپنے طریق کار کو درست قرار دیتے ہوئے اسی پر برقرار رہنے کا اعلان کر دیا جس پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی ہائی کمان نے وفاق کے ساتھ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا الحاق ختم کرنے کا اعلان کیا اور اس کے چند روز بعد وفاق المدارس کی مجلس عاملہ نے ایک باضابطہ اجلاس میں اپنے موقف کا اعلان کیا کہ اس کے نزدیک لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے منتظمین کے مطالبات درست ہیں مگر طریقہ کار غلط ہے جس سے وفاق کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجلس عاملہ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ جائز مطالبات کی منظوری کا اعلان کرے اور طاقت کے استعمال کے بجائے مذاکرات کے ذریعے سے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ مجلس عاملہ کے اعلان میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ اگر حکومت نے طاقت کا استعمال کیا تو یہ بھی ایک غلط طریق کار ہوگا جس کی وفاق کی طرف سے شدید مخالفت کی جائے گی۔

اس پس منظر میں جب لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع میں مزید شدت پیدا ہوئی، سرکاری فورسز نے ان دونوں اداروں کو گھیرے میں لے لیا، دونوں طرف سے فائرنگ اور مسلح تصادم کے واقعات میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا اور وفاق کی قیادت نے محسوس کیا کہ مزید خونریزی اور خوفناک تصادم کو روکنے کے لیے کردار ادا کرنا ضروری ہو گیا ہے تو وفاق کے سربراہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان نے اس سلسلے میں پیش رفت کا فیصلہ کیا، چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور دیگر سرکردہ علماے کرام اسلام آباد تشریف لائے اور غازی برادران سے بات کی کہ وہ تصادم کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے لچک پیدا کریں اور کسی درمیانی راستے پر آئیں۔ اس پر مولانا عبدالرشید غازی نے چند شرائط پر خود کو علماے کرام کے حوالے کرنے کی پیش کش کی مگر بات بوجوہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے بعد جمعیۃ علماے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا جس میں ان کے ساتھ اسلام آباد اور راول پنڈی کے سرکردہ علماے کرام کے علاوہ پاکستان شریعت کونسل پنجاب کے امیر مولانا عبدالحق خان بشیر بھی شریک تھے، مگر ڈیڈلاک بدستور باقی رہا۔

۸؍جولائی کو حضرت مولانا سلیم اللہ خان خود، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، حضرت مولانا

ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا ڈاکٹر محمد عادل خان اور دیگر علمائے کرام کے ہمراہ کراچی سے اسلام آباد پہنچے جبکہ ان کی ہدایت پر مولانا قاری محمد حنیف جالندھری ملتان سے اور راقم الحروف گوجرانوالہ سے اسلام آباد پہنچے بلکہ میں اس روز دارالعلوم رحیمیہ ملتان کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے وہاں جا رہا تھا اور لاہور پہنچ چکا تھا جہاں سے مجھے تین بجے ملتان کے لیے پی آئی اے کی فلائٹ پکڑنا تھی مگر حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کے حکم پر میرا روٹ اچانک تبدیل ہو گیا اور میں تین بجے ملتان کی فلائٹ پر سوار ہونے کے بجائے دو بجے اسلام آباد کی فلائٹ پر سوار ہو گیا۔

اسلام آباد پہنچے تو ہم نے یہ طے کیا کہ ہمارا بنیادی ہدف حکومت اور عبدالرشید غازی صاحب کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ دوبارہ شروع کرانا، مزید خونریزی کو روکنا، اور انسانی جانوں کو ضائع ہونے سے بچانا ہوگا اور اس کے لیے ہم اپنی پوری صلاحیتیں اور قوت صرف کریں گے۔ اس مرحلہ پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہمارا اسلام آباد آنا کسی کی دعوت پر نہیں تھا جیسا کہ ایک ٹی وی چینل کے نشریہ میں آج یہ کہا گیا ہے کہ ان علمائے کرام کو بلایا گیا تھا اور یہ انہی بلانے والوں کے مہمان ہیں۔ یہ قطعی طور پر غلط بات ہے۔ ہم وفاق المدارس کی ہائی کمان کے اپنے فیصلے کے مطابق آئے ہیں، وفاق کے انتظامات کے تحت یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور اسی کے پروگرام کے مطابق واپس چلے جائیں گے۔

بہرحال ہم نے یہ طے کیا کہ سب سے پہلے چودھری شجاعت حسین صاحب سے رابطہ کیا جائے اور ان سے بات کر کے مزید پیش رفت کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ چودھری صاحب سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ وہ ابھی ایک گھنٹہ کے بعد وزیراعظم سے ملاقات کے لیے جا رہے ہیں، اس لیے آپ حضرات ابھی آسکیں تو آجائیں۔ ہم اس وقت کھانے کے لیے میز پر بیٹھ چکے تھے، مگر کھانا وہیں چھوڑ کر بھاگم بھاگ چودھری شجاعت حسین کے ہاں پہنچے تو وہ وفاقی وزرا جناب نصیر خان، جناب انجینئر امیر مقام اور دیگر رفقا کے ہمراہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے وفد میں حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا ڈاکٹر عادل خان، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور راقم الحروف کے علاوہ اسلام

آباد اور راولپنڈی کے علمائے کرام میں سے مولانا قاضی عبدالرشید، مولانا محمد نذیر فاروقی، مولانا محمد شریف ہزاروی اور دیگر علمائے کرام بھی شامل تھے۔ حضرت مولانا سلیم اللہ خان کی قیادت میں جانے والے اس وفد کے متکلم مولانا مفتی رفیع عثمانی تھے۔ انھوں نے ملک کے دینی حلقوں اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے وابستہ ہزاروں مدارس کی ترجمانی کرتے ہوئے چودھری صاحب کو بتایا کہ اس سے قبل صورت حال یہ تھی کہ مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی ایک غلط طریق کار پر بے جا اڑے ہوئے تھے اور حکومت نے صبر وتحمل اور مذاکرات کا راستہ اختیار کر کے بہتر طرز عمل کا مظاہرہ کیا، لیکن اب حکومت نے طاقت استعمال کر کے اور مذاکرات کا راستہ بند کر کے جو رویہ اختیار کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بھی غلط ہے اور اس سے جو جانی نقصان ہو رہا ہے، اس سے یہ تاثر پھیل رہا ہے کہ حکومت بھی ایک غلط بات پر اڑ گئی ہے، اس لیے ہم یہ مطالبہ لے کر آئے ہیں کہ فوجی طور پر فوجی آپریشن بند کیا جائے، مذاکرات دوبارہ شروع کرنے کے اعلان کیا جائے، وہاں جو لاشیں بتائی جاتی ہیں انھیں نکالا جائے، زخمیوں کو علاج کے لیے ہسپتالوں میں منتقل کیا جائے، انسانی ہمدردی کی بنیاد پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود طالبات اور طلبہ کو خوراک اور دیگر بنیادی ضروریات فراہم کی جائیں، پانی کا کنکشن بحال کیا جائے اور عبدالرشید غازی صاحب نے جو شرائط باہر نکلنے کے لیے پیش کی ہیں، انھیں یکسر مسترد کرنے کے بجائے ان پر دوبارہ غور کر لیا جائے تا کہ کوئی قابل عمل درمیانی راستہ نکالا جا سکے۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کے ساتھ عبدالرشید غازی صاحب کی اس سے قبل ہونے والی گفتگو کی روشنی میں چودھری صاحب کو بتایا گیا کہ عبدالرشید غازی چند شرائط پر ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہیں اور وہ یہ ہیں کہ:

...... عبدالرشید غازی کو ان کے خاندان اور ذاتی سامان سمیت ان کے آبائی گاؤں (روجھان، ڈیرہ غازی خان) میں منتقل کر دیا جائے اور ان کی گرفتاری یا نظر بندی نہ کی جائے۔

...... جامعہ حفصہ اور لال مسجد میں مقیم طالبات، طلبہ اور دیگر افراد میں سے کسی کو لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع کے حوالہ سے درج کسی مقدمہ میں گرفتار نہ کیا جائے، البتہ ان میں سے کوئی

فرد لال مسجد کے تنازع سے پہلے کے کسی کیس میں مطلوب ہے تو اس کی گرفتاری پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

...... وہ لال مسجد، جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ تینوں کے نظم ونسق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا انتظام وفاق المدارس کے سپرد کر دیا جائے اور لال مسجد کا نظام محکمہ اوقاف اسلام آباد کی تحویل میں دیا جائے جو وفاق المدارس کے مشورہ سے اس کے انتظامات کرے۔

یہ غازی صاحب کی شرائط تھی جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ یہ حکومت کی طرف سے اس عام معافی کے اعلان کی ایک عملی شکل تھی جس کا خود حکومت نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد کے لیے چند ہفتے قبل اعلان کیا تھا، اس لیے ہم نے عرض کیا کہ جب حکومت خود اس سے قبل عام معافی کا اعلان کر چکی ہے تو اس کی عملی شکل کے طور پر ان شرائط کو قبول کر لیا جائے اور انسانی جانوں کے مزید ضیاع کو روکنے کے لیے عبدالرشید غازی کو ان کی شرط کے مطابق لال مسجد سے نکلنے کا محفوظ راستہ دے دیا جائے۔

یہ شرائط چودھری شجاعت حسین صاحب اور ان کے رفقا کے علم میں اس سے قبل بھی آ چکی تھیں، اس لیے ہمیں اپنا موقف سمجھانے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی، البتہ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے اس موقع پر اس بات کا حوالہ دیا کہ ایسے موقع پر انسانوں جانوں کو بچانے کے لیے اس سے زیادہ سخت شرائط دنیا میں تسلیم کی جاتی رہی ہیں بلکہ خود پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں کابل ایئرپورٹ پر کھڑے پی آئی اے کے اغوا شدہ طیارے میں موجود ایک سو پچیس مسافروں کی جانیں بچانے کے لیے پاکستان کی مختلف جیلوں سے تین سو کے لگ بھگ مجرموں کو رہا کر دیا گیا تھا، اس لیے اگر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد بالخصوص بچوں اور عورتوں کی جانیں بچانے کے لیے عبدالرشید غازی کی یہ شرائط تسلیم کر لی جائیں تو مزید خونریزی کو روکا جا سکتا ہے۔ علما کے وفد نے چودھری شجاعت حسین سے کہا کہ ہماری تجویز یہ ہے کہ انسانی جانوں کو بچانے کے لیے حکومت بڑے پن کا مظاہرہ کرے اور غازی عبدالرشید کی یہ ضد اگر بے جا بھی ہے تو بھی

اسے مان لے تاکہ مزید خونریزی کو روکا جا سکے۔ اس موقع پر وفد کے بعض ارکان کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ فوری طور پر دونوں طرف سے سیز فائر کیا جائے، آپریشن روک دیا جائے، وہاں سے غیرضروری فورسز ہٹالی جائیں اور اس کے بعد تمام معاملات سپریم کورٹ آف پاکستان یا وفاقی شرعی عدالت کے سپرد کر دیے جائیں اور وہ جو فیصلہ بھی کریں، دونوں فریق اسے قبول کرلیں۔

گفتگو کے دوران میں ایک موقع پر ملک کی عمومی صورت حال اور اہل دین کے حوالے سے حکومت کی پالیسیوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی خاصے جذباتی ہو گئے اور صدر جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کو سختی کے ساتھ ہدف تنقید بنایا جس پر فضا گرم ہوتے ہوتے رہ گئی، مگر مجموعی طور پر گفتگو کا ماحول مناسب رہا اور ہم نے اپنے جذبات اور موقف چودھری شجاعت حسین صاحب اور ان کے رفقا تک اس خیال سے پہنچا دیے کہ وہ صدر اور وزیراعظم کے پاس جا رہے ہیں، انھیں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف مسلح آپریشن کے بارے میں دینی حلقوں کے جذبات سے آگاہ کریں گے۔ چودھری صاحب نے کہا کہ وہ ہمارا یہ موقف اور جذبات وزیراعظم اور صدر مملکت تک پہنچا دیں گے اور ان کی پوری کوشش ہوگی کہ معاملات کو افہام وتفہیم کے ساتھ حل کرنے اور تصادم کے امکانات کو روکنے کے لیے کوئی قابل عمل راستہ نکالا جائے۔

اس موقع پر میڈیا کے حضرات بھی موجود تھے جنھوں نے گفتگو کی مجموعی رپورٹ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں سے الگ الگ انٹرویو بھی لیے۔ میں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اس سے قبل ہم یہ کہتے رہے ہیں کہ لال مسجد کی انتظامیہ کے مطالبات صحیح ہیں لیکن ان کا طریق کار غلط ہے، لیکن اب حکومت بھی طاقت کے استعمال کا غلط طریق کار اختیار کر کے اسی پوزیشن پر آ گئی ہے اور ہم حکومت کو یہ بتانے کے لیے آئے ہیں کہ اس کے اس طرز عمل کا ردعمل انتہائی شدید ہوگا اور ملک بھر کے دینی حلقوں اور عوام میں سخت اشتعال پیدا ہوگا۔ ایک صحافی دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ ریاست کو مذہب سے الگ کرنے کی کسی مہم کا حصہ تو نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس قسم کی کارروائیاں اسی مقصد کے لیے کی جاتی ہیں لیکن پاکستان میں ایسا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ پاکستان کی نہ صرف دستوری بنیاد اسلامی نظریہ پر ہے بلکہ اس کے وجود کی بنیاد بھی اسلام پر ہی ہے، اس لیے پاکستان کو

اس کے قیام کے نظریاتی اور تہذیبی پس منظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پاکستان اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔

بہرحال ہم چودھری شجاعت حسین صاحب سے یہ عرض کر کے اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے کہ ہم آپ کے جواب کے منتظر رہیں گے۔ مغرب کے بعد وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کا وفاقی وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق سے رابطہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ وہ خود ہمارے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے اور ان کے ساتھ کم وبیش ایک گھنٹہ تک انہی امور پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ چودھری شجاعت حسین کے ساتھ ہماری ملاقات کی تفصیلات صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم جناب شوکت عزیز تک پہنچ چکی ہیں۔ خود ان حضرات کی بھی خواہش ہے کہ افہام وتفہیم کے ساتھ مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نکل آئے اور اس مقصد کے لیے وزیراعظم کے ساتھ آپ حضرات کی ملاقات کا پروگرام طے کیا جا رہا ہے۔ اس دوران ہم نے صدر جنرل پرویز مشرف سے براہ راست ملاقات کے لیے وفاق المدارس کی طرف سے ایک مکتوب بذریعہ فیکس بھجوا دیا تھا جس کی وصولی کی ان کے آفس سے اطلاع مل گئی تھی اور جنرل شفقات صاحب کے ساتھ قاری محمد حنیف جالندھری کی فون پر گفتگو بھی ہو گئی تھی لیکن جب اعجاز الحق نے بتایا کہ صدر اور وزیراعظم دونوں تک ہمارا موقف اور جذبات پہنچ چکے ہیں اور وزیراعظم کے ساتھ ہماری ملاقات کا پروگرام طے کیا جا رہا ہے تو پھر ہم نے صدر کے ساتھ ملاقات کا زیادہ پیچھا نہیں کیا۔

اگلے روز ۹ جولائی کو ڈھائی بجے وزیراعظم جناب شوکت عزیز کے ساتھ ہماری ملاقات ہوئی جس میں ہماری طرف سے مولانا سلیم اللہ خان، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا حکیم محمد مظہر، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا ڈاکٹر عادل خان اور راقم الحروف کے علاوہ مولانا مفتی محمد اور مولانا قاضی عبدالرشید بھی شامل تھے جبکہ وزیراعظم کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین صاحب، جناب اعجاز الحق، جناب محمد علی درانی، جناب طارق عظیم اور دیگر حضرات تھے۔ وزیراعظم نے علمائے کرام کی اسلام آباد میں آمد کا خیر مقدم کیا، ان کے

مصالحتی جذبہ کو سراہا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ خدا کرے کہ یہ کوشش کامیاب ہو اور انسانی جانوں کو بچایا جا سکے۔ انہیں وفاق المدارس کے موقف اور جذبات سے آگاہ کیا گیا جس کی اطلاع انہیں پہلے بھی مل چکی تھی اور جو نکات چودھری شجاعت حسین صاحب کے ساتھ ملاقات میں زیر بحث آئے تھے، وہ وزیر اعظم کے سامنے پھر دہرائے گئے جن میں سے غازی عبدالرشید کو محفوظ راستہ دینے کے بارے میں تھوڑی بہت بات ہوئی مگر پھر اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ ان کی گرفتاری یا نظر بندی نہیں ہوگی اور یہ بات چودھری شجاعت حسین صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ خود مجلس میں دہرائی۔ دوسرے نکات پر بھی اصولی اتفاق رائے ہو گیا اور طے پایا کہ اس کی تفصیلات وفاق المدارس کے ذمہ دار حضرات وفاقی وزرا کے ساتھ مل کر طے کر لیں گے۔

ہم نے گزارش کی کہ علمائے کرام کا وفد غازی عبدالرشید سے براہ راست ملاقات کے لیے لال مسجد جانا چاہتا ہے، مگر وزیر اعظم نے اس کی اجازت دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے، اس لیے آپ حضرات کو لال مسجد میں جانے کی ہم اجازت نہیں دیں گے۔ البتہ وہاں جو ٹاکنگ پوائنٹ حکومت کی طرف سے بنایا گیا ہے، وہاں جا کر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے آپ ان سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ یہ صورت حال ہمارے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ مگر وزیر اعظم سے ملاقات سے فارغ ہو کر جب ہم اپنی قیام گاہ تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ لال مسجد میں جانے کا پروگرام بن گیا ہے اور ہم لوگ چودھری شجاعت حسین صاحب اور اعجاز الحق صاحب کے ساتھ پانچ بجے کے بعد وہاں جائیں گے۔ اس دوران میں ٹیلی فون پر غازی عبدالرشید کے ساتھ بھی رابطہ ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ وہ چودھری صاحب اور علمائے کرام کا لال مسجد میں خیر مقدم کریں گے اور انہیں پورا تحفظ دیا جائے گا حتیٰ کہ اس کی تفصیلات بھی طے ہو گئیں کہ کون سے راستے سے جائیں گے، کہاں تک گاڑیوں پر جائیں گے اور کون سے دروازے سے اندر داخل ہوں گے، مگر جب علمائے کرام کا وفد چودھری شجاعت حسین صاحب، اعجاز الحق صاحب، محمد علی درانی صاحب، طارق عظیم صاحب، اور عبدالستار ایدھی کے ہمراہ وہاں پہنچا تو وہاں موجود حکام نے ہمیں لال مسجد جانے سے روک دیا اور کہا کہ آپ حضرات میں سے کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس دوران میں

غازی عبدالرشید نے فون پر ہونے والی گفتگو میں یہ کہا کہ وفاقی وزرا کے ساتھ علما کی گفتگو میں مولانا فضل الرحمٰن خلیل کو بھی شامل کیا جائے، چنانچہ ان کے اصرار پر انہیں بلا لیا گیا اور وہ اس کے بعد ہونے والی گفتگو میں ہمارے ساتھ شریک رہے۔

ہم شام پونے چھ بجے کے لگ بھگ اس جگہ تک پہنچے جسے ٹاکنگ پوائنٹ کا نام دیا گیا ہے اور جہاں سے آگے کسی کو نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ وہاں ایک گاڑی پر لاؤڈ اسپیکر نصب تھا جس کے ذریعے سے لال مسجد کے اندر کے لوگوں کو خطاب کیا جاتا تھا اور وہ جس بات کا جواب ضروری سمجھتے، مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے اس کا جواب دیتے تھے۔ ہم سے بھی کہا گیا کہ اس لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے اندر کے لوگوں سے خطاب کریں اور انہیں ہتھیار ڈالنے کے لیے کہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم اس کام کے لیے نہیں آئے۔ اگر اندر جانے کی اجازت ہے تو ہم براہ راست وہاں جا کر عبدالرشید غازی کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار ہیں، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ٹیلی فون کا رابطہ ہی کافی ہے، ہم لاؤڈ اسپیکر کو ان کے ساتھ گفتگو کے لیے ذریعہ بنانے کو تیار نہیں ہیں۔

اس دوران میں قریب کے ایک خالی مکان میں ہمارے مل بیٹھنے کا بندوبست کیا گیا اور ہم مذکورہ بالا وفاقی وزرا اور چودھری شجاعت حسین صاحب کے ساتھ اس اصولی مفاہمت کی تفصیلات طے کرنے بیٹھ گئے جو وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات کے دوران میں طے پا گئی تھی۔ ایک ایک شق پر بحث ہوئی، ہر شق کے مختلف پہلوؤں پر دونوں طرف سے تحفظات کا اظہار ہوتا رہا اور رات تقریباً سوا بارہ بجے ہم ایک تحریر پر متفق ہوئے جن کے نکات طارق عظیم صاحب نے لکھے، اسے باقاعدہ فارمولے کی شکل میں نے دی اور جب ہم اس پر اتفاق رائے کر چکے تو ہمیں بتایا گیا کہ اب اسے لے کر چودھری شجاعت حسین صاحب ایوان صدر جائیں گے اور وہاں سے منظوری کے بعد اسے حتمی شکل دی جائے گی جبکہ اسے فون پر غازی عبدالرشید کو سنایا جا چکا تھا اور انہوں نے بھی اس سے اتفاق کا اظہار کر دیا تھا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے، وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات میں اصولی طور پر طے پا جانے والے نکات کی روشنی میں ہے، اس لیے مزید کسی جگہ سے اس کی توثیق کی ضرورت نہیں

پڑے گی، لیکن ہمیں بتایا گیا کہ ایسا ضروری ہے اور چودھری صاحب نے کہا کہ آپ حضرات انتظار کریں، ہم آدھ پون گھنٹہ میں واپس آ رہے ہیں۔ مجلس میں شریک دونوں طرف کے حضرات کے نزدیک یہ معاملات تقریباً طے پا چکے تھے۔ چودھری وجاہت حسین صاحب بار بار اصرار کر رہے تھے کہ یہ سارا عمل رات ہی رات مکمل کر لیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ وہ جامعہ حفصہ اور لال مسجد میں موجود لوگوں کو منتقل کرنے کے لیے کتنی گاڑیوں کا بندوبست کریں اور اس کے ساتھ یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ جب ہم تھوڑی دیر کے بعد سب اندر جائیں گے تو وہاں موجود افراد کے لیے کھانا بھی ساتھ لے کر جائیں گے، اس کا انتظام کر لینا چاہیے۔ اس پر یہ تجویز دی گئی کہ لاہور کے داتا دربار کی طرح اسلام آباد میں بھی بعض مقامات پر پکی پکائی دیگیں مل جاتی ہیں، وہاں سے منگوالی جائیں حتیٰ کہ ایک مرحلہ پر چودھری وجاہت حسین نے بتایا کہ وہ بیس دیگوں کا انتظام کر رہے ہیں، لیکن جب انتظار طویل ہوتا گیا تو ہمارے ذہنوں میں تشویش پیدا ہوئی اور ہم نے (مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور راقم الحروف) اس پر آپس میں بات بھی کی، چنانچہ جب رات اڑھائی بجے کے لگ بھگ چودھری شجاعت حسین صاحب وفاقی وزرا کے ہمراہ واپس آئے تو ان کے پاس ہماری طے شدہ تحریر کے بجائے ایک اور تحریر تھی جس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ صرف اسے قانونی شکل دینے کے لیے نئے سرے سے لکھا گیا ہے، مگر جب اسے پڑھ کر سنایا گیا تو اس میں پہلی تحریر کے تینوں نکات غائب تھے۔

...... غازی عبدالرشید کے لیے لکھا گیا تھا کہ انہیں ان کے خاندان سمیت گھر میں رکھا جائے گا اور ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہوگی۔

...... لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود طلبہ اور دیگر مرد حضرات کو لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع کے حوالہ سے گرفتار نہ کرنے کی بات حذف کر دی گئی تھی اور لکھا گیا تھا کہ ان میں سے جو شخص (تنازعہ سے قبل یا بعد کے فرق کے بغیر) کسی بھی مقدمہ میں مطلوب ہوگا، اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔

...... جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو وفاق المدارس کی تحویل میں دینے کی بات بھی حذف کر

دی گئی تھی۔

یہ تینوں باتیں ہماری تجاویز نہیں تھیں بلکہ غازی عبدالرشید کی شرائط تھیں جن پر انہیں شدت سے اصرار تھا، اس لیے ہم ان کے بارے میں از خود کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لیے طے پایا کہ فون پر یہ نئی تحریر غازی عبدالرشید کو سنا دی جائے اور اگر وہ اسے قبول کرلیں تو ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن جب مولانا فضل الرحمٰن خلیل نے انہیں فون پر یہ تحریر سنائی تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مولانا فضل الرحمٰن خلیل ہمارے سامنے انہیں سمجھاتے رہے کہ حالات کی سنگینی کا تقاضا ہے کہ وہ اسے قبول کرلیں، لیکن جب وہ نہ مانے تو مولانا فضل الرحمٰن خلیل نے فون میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے غازی عبدالرشید سے بات کی جو میری ان سے آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس تحریر میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا اور ہاں یا نہ میں جواب درکار ہے جس کے لیے صرف آدھے گھنٹے کی گنجائش ہے، اس لیے آپ اسے قبول کرلیں تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ وہ پہلے والی تحریر جو مجھے سنائی گئی تھی، اب بھی میرے لیے قابل قبول ہے لیکن دوسری تحریر کو آپ تبدیل کرانے کی کوشش کریں۔ میں نے کہا کہ ایسا عملاً ممکن نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے، ان سے کہیں کہ یہ ہمارا قتل عام کریں، قیامت کے دن میں آپ سب حضرات سے اس کے بارے میں بات کرلوں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت خود میرے حواس بھی قابو میں نہیں رہے تھے، اس لیے میں نے مزید کوئی بات کیے بغیر ٹیلی فون دوبارہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس تحریر میں کوئی ردوبدل ممکن نہ ہونے کی بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ ان حضرات نے آتے ہی ہمیں دوٹوک طور پر کہہ دیا تھا کہ یہ آخری اور حتمی فیصلہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس کا جواب ہاں یا نہ میں دیں اور اس کے لیے ہمارے پاس نصف گھنٹہ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس دوران میں ایک اعلیٰ فوجی افسر مذاکرات کے کمرے میں تشریف لائے اور کرسی پر بیٹھ کر ہماری گفتگو کا جائزہ لیتے رہے۔ میں فوجی رینکوں کے درجات کو نہیں پہچانتا، اس لیے ان کی وردی اور بیجوں سے مجھے اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ کس سطح کے افسر ہیں، لیکن ان کا لہجہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ

کمانڈر ہیں، اس لیے کہ جب گفتگو کے دوران میں غازی عبدالرشید نے کہا کہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل اور مولانا زاہدالراشدی یہ تحریر لے کر میرے پاس آ جائیں، ہم اس پر دوبارہ غور کر لیتے ہیں مگر ان فوجی افسر صاحب نے انتہائی تحکمانہ لہجے میں کہا کہ میں فضل الرحمٰن خلیل کے علاوہ کسی اور شخص کو اندر جانے کی اجازت نہیں دوں گا اور یہ بھی صرف پندرہ منٹ کے لیے جا سکیں گے، اس سے زیادہ وقت نہیں ہے۔

اس صورت حال میں ان مذاکرات میں مزید حصہ دار بننا ہمارے لیے ممکن ہی نہ تھا، اس لیے ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور وہاں سے فوری چلے آنے کا فیصلہ کیا۔ صورت حال کی سنگینی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم زبانی طور پر السلام علیکم کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئے اور کسی سے رخصتی مصافحہ نہ کر سکے اور ان میں سے بھی کسی دوست کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ہمیں مزید رکنے کا کہیں یا ہم سے رخصتی مصافحہ کر لیں۔ دونوں فریقوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ہم علمائے کرام وہاں سے فوراً روانہ ہو جائیں حتیٰ کہ دوسرے کمرہ میں موجود ہمارے بعض ساتھیوں نے بتایا کہ کمرے سے باہر سرکاری وفد کے دو حضرات آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ ''ان مولویوں کو یہاں سے جلدی چلتا کرو۔'' چنانچہ ہم وہاں سے اڑھائی بجے کے لگ بھگ چلتے بنے لیکن جب ہم اپنی قیام گاہ میں پہنچ کر تھوڑی دیر باہمی مشاورت کے بعد نماز فجر کا وقت داخل ہونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ نماز پڑھ کر کچھ نیند کر لیں تو دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور میڈیا نے خبر دی کہ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں اور آپریشن کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

مذاکرات کے حوالے سے چند باتیں اور بھی ہیں جن کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض وفاقی وزرا نے اپنے انٹرویوز میں کہا ہے کہ مذاکرات کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ عبدالرشید غازی نے یہ شرط لگا دی تھی کہ ان کے ساتھ لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں جو غیر ملکی موجود ہیں، انھیں بھی تحفظ فراہم کیا جائے اور یہ بات حکومت کے لیے قابل قبول نہیں تھی جبکہ اصل بات یہ ہے کہ وفاق المدارس العربیہ کے وفد کا ٹیلی فونک رابطہ غازی عبدالرشید سے، وزیر اعظم سے ہماری ملاقات کے بعد قائم ہوا جو وقفہ وقفہ سے رات اڑھائی بجے تک جاری رہا اور اس وقت تک غیر ملکیوں کے

حوالے سے ان کی طرف سے کوئی بات سامنے نہیں آئی اور مقدمات اور گرفتاریوں کے بارے میں صرف اس پہلو پر بات چیت ہوتی رہی کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع سے قبل یعنی چلڈرن لائبریری پر جامعہ حفصہ کی طالبات کے قبضہ سے پہلے کے مقدمات میں اگر کوئی شخص مطلوب ہے تو اس کی گرفتاری پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا، البتہ چلڈرن لائبریری پر قبضہ کے بعد درج کیے جانے والے مقدمات میں کسی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ یہ غازی عبدالرشید کی شرط تھی جسے وزیر اعظم کے ساتھ ہماری ملاقات کے دوران میں تسلیم کر لیا گیا تھا مگر صدر جنرل پرویز مشرف نے اسے مسترد کر دیا جس کا انہوں نے قوم سے نشری خطاب کے دوران خود بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ عبدالرشید غازی کو گرفتاری یا نظر بندی سے مستثنیٰ کرنے اور ان کے ساتھ لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد کو چلڈرن لائبریری کے بعد درج کیے جانے والے مقدمات میں گرفتار نہ کرنے کی شرط قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جس کی وجہ سے علما اور وزرا کا مرتب کردہ مصالحتی فارمولا ناکام ہو گیا۔

اس لیے اس مرحلے میں یہ وضاحت ہماری طرف سے ضروری ہو گئی ہے کہ ہمارے ساتھ گفتگو کے دوران میں غازی عبدالرشید نے غیر ملکیوں کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا ڈاکٹر عادل خان اور راقم الحروف پر مشتمل وفد جب رات اڑھائی بجے کے لگ بھگ مذاکرات سے لاتعلق ہو کر لال مسجد کے قریب ٹاکنگ پوائنٹ سے واپس آیا تو اس کے بعد وزرا کی بات چیت مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے سے کم وبیش ڈیڑھ گھنٹہ تک چلتی رہی۔ اسی وجہ سے ہم نے اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر یہ طے کیا کہ ہم سردست میڈیا سے کوئی بات نہیں کریں گے اور ہمارے بعد ہونے والی اس گفتگو کے نتائج کا انتظار کریں گے تاکہ میڈیا کے ساتھ ہماری کسی بات سے اس گفتگو کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ ہماری خواہش اور دعا تھی کہ خدا کرے، اس گفتگو کا ہی کوئی مثبت نتیجہ نکل آئے اور جس نقصان اور المیہ سے ہم ڈر رہے تھے، اس کو روکنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے باہمی مشورہ سے اپنے موبائل فون بند کر دیے اور نماز فجر ادا کرنے کے بعد کمرے بند کر کے سو گئے۔ مجھے ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ حامد میر صاحب نے آ کر جگایا۔ انہیں کسی ذریعے سے پتہ چل گیا تھا کہ میں فلاں ہوٹل کے فلاں کمرے

میں سویا ہوا ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی اور پاکستان شریعت کونسل پنجاب کے امیر مولانا عبدالحق خان بشیر بھی اسی کمرے میں میرے ساتھ تھے اور میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ مجھے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے نہ جگایا جائے، مگر حامد میر صاحب کے اصرار پر مجھے جگا دیا گیا اور اس وقت تک رونما ہونے والی صورت حال سے مجھے آگاہ کیا گیا تو میں نے میر صاحب کو جیو کے لیے وہ انٹرویو دیا جو بار بار نشر ہو چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وزرا اس قدر اعتماد کے ساتھ غیر ملکیوں کے حوالے سے بات کر رہے ہیں تو ممکن ہے، ہماری واپسی کے بعد مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے سے ہونے والی گفتگو میں عبدالرشید غازی نے اس قسم کی کوئی بات کی ہو، لیکن مجھے رات ایک دوست نے بتایا کہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل نے بھی ایک ٹی وی چینل کو دیے گئے انٹرویو میں یہ وضاحت کی ہے کہ ان کے ساتھ عبدالرشید غازی نے غیر ملکیوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

اسی طرح لال مسجد کے بارے میں سپریم کورٹ کے ازخود نوٹس لینے کے حوالہ سے جو صورت حال پیدا ہوئی، اسے بھی ریکارڈ میں لانا ضروری ہے۔ سپریم کورٹ نے اس واقعہ کا ازخود نوٹس لے کر حکومت کو عدالت میں طلب کیا اور ہدایات جاری کیں جو اخباری اطلاعات اور وہاں موجود افراد کے ذریعے سے ہم تک پہنچیں۔ وہ یہ تھیں کہ:

......لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد کی جانوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔

......علما کی جس مصالحتی کمیٹی نے وزیر اعظم سے ملاقات کی ہے، اس کے لال مسجد میں جانے اور عبدالرشید غازی کے ساتھ مذاکرات کا اہتمام کیا جائے۔ اس مصالحتی کمیٹی کو سرکاری طور پر سہولت فراہم کی جائے اور اسے تحفظ فراہم کیا جائے۔

......لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود افراد اگر ہتھیار ڈالیں تو اس وقت سیشن جج اسلام آباد وہاں موجود ہوں تاکہ سپریم کورٹ کی ہدایات پر عملدرآمد کی نگرانی کر سکیں، وغیر ذلک۔

ہمیں خوشی ہوئی کہ اس سے ہمیں اپنے مصالحتی مشن میں سپورٹ حاصل ہوگی، لیکن عملاً جو کچھ ہوا، اس سے ہمارے لیے مشکلات پیدا ہوئیں اور مصالحتی کمیٹی کو سپورٹ کرنے کے لیے عدالت عظمٰی کی یہ ہدایت عملاً مصالحتی کمیٹی کے لیے رکاوٹوں کا باعث بن گئی جس کی کچھ واقعاتی تفصیل عرض کرنا

چاہتا ہوں۔

ہم ٹا کنگ پوائنٹ کے قریب ایک مکان کی بالائی منزل میں وفاقی وزرا کے ساتھ مصالحتی فارمولا کو حتمی شکل دینے کے لیے مذاکرات میں مصروف تھے اور عبدالرشید غازی کے ساتھ فون پر گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ اچانک نیچے سے لاؤڈ اسپیکر پر ایک اعلان شروع ہو گیا جو اسلام آباد کے سیشن جج صاحب کی طرف سے تھا کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے حکم کے مطابق وہ عبدالرشید غازی اور ان کے ساتھ موجود تمام افراد کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ فوری طور پر ہتھیار ڈال دیں اور سیشن جج کی موجودگی میں خود کو قانون کے حوالہ کر دیں۔

میں نے اس موقع پر طارق عظیم صاحب اور دیگر وزرا سے کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سپریم کورٹ کے آرڈر پر ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر یہ ضروری تھا تو ہمارے آنے سے پہلے ہو سکتا تھا یا ہمارے جانے تک اسے موخر کیا جا سکتا تھا، لیکن عین اس وقت جبکہ ہم عبدالرشید غازی کے ساتھ مصالحت کی تفصیلات طے کر رہے ہیں، ہماری موجودگی میں یہ اعلان مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش ہے۔ اس پر طارق عظیم اور اعجاز الحق کے ساتھ میری خاصی تلخی ہو گئی۔ ہم نے اصرار کیا کہ اس اعلان کو فوراً رکوایا جائے مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک وکیل رائے بشیر صاحب نے، جو سپریم کورٹ کی عدالتی کارروائی میں وہاں موجود تھے اور ہمارے ساتھ رات کو ساتھ والے کمرے میں دوسرے حضرات کے ساتھ ہماری گفتگو کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے، بتایا کہ ان سے اسلام آباد انتظامیہ کے ایک ذمہ دار افسر نے کہا کہ ہم سیشن جج صاحب کو گھر سے لے کر آئے ہیں، وہ ابھی اعلان کریں گے۔ آپ بھی بطور وکیل ان کے ساتھ کھڑے ہو کر لال مسجد والوں سے ہتھیار ڈالنے کی اپیل کریں مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔

ہم نے وزرا سے کہا کہ ہماری معلومات کے مطابق سپریم کورٹ آف پاکستان نے حکومت کو ہدایت کی ہے کہ وہ علما کی مصالحتی کمیٹی کے لال مسجد میں جانے اور عبدالرشید غازی کے ساتھ ان کی ملاقات کا اہتمام کرے۔ حکومت اس سلسلے میں کیا کر رہی ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ حضرات کو اسی لیے یہاں لایا گیا ہے کہ آپ ٹا کنگ پوائنٹ پر سیشن جج صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر لاؤڈ اسپیکر

کے ذریعے سے اعلان کریں اور اندر والوں سے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہیں۔ ہم نے گزارش کی کہ ہم تو مصالحت کے لیے آئے ہیں، ہتھیار ڈالنے کا اعلان کرنے کے لیے نہیں آئے۔ انہوں نے کہا کہ سپریم کورٹ نے یہی کہا ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ اگر ہمارا کام صرف سیشن جج صاحب کے ساتھ کھڑے ہوکر یہ اعلان کرنا ہے تو پھر ''مصالحتی کمیٹی'' کا کیا مطلب ہے؟ اس کا کوئی جواب وزرا کی طرف سے نہیں دیا گیا۔

رات دو بجے کے بعد جب چوہدری شجاعت حسین صاحب اور وفاقی وزرا ایوان صدر سے ایک نیا مسودہ لے کر آئے اور اسے پڑھا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ ہمارے ساتھ آپ نے طے کیا تھا کہ عبدالرشید غازی کو گرفتار یا نظر بند نہیں کیا جائے گا اور ان کے ساتھیوں میں سے بھی کسی کو چلڈرن لائبریری پر قبضہ کے بعد درج کیے جانے والے کسی مقدمہ میں گرفتار نہیں کیا جائے، مگر اس نئی تحریر میں یہ دونوں باتیں ختم کر دی گئی ہیں تو ان وفاقی وزرا نے کہا کہ سپریم کورٹ کے آرڈر کے بعد ایسا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ اگر ہم وہی کچھ لکھیں جو پہلی تحریر میں لکھا گیا تھا تو ہم سپریم کورٹ کے احکام کی خلاف ورزی اور توہین عدالت کے مرتکب قرار پا سکتے ہیں، جبکہ ہمارا موقف تھا کہ جب سپریم کورٹ نے ہماری ''مصالحتی کمیٹی'' کی مصالحتی حیثیت اور کردار کو تسلیم کر لیا ہے تو ہمارے ذریعے سے جو بھی مصالحت طے پائے گی، وہ قانون کی خلاف ورزی یا سپریم کورٹ کے حکم سے انحراف متصور نہیں ہوگی، لیکن ہمارے اس موقف کو تسلیم نہیں کیا گیا اور وزرا نے یہ کہہ کر ایوان صدر سے لائی گئی تحریر میں کسی قسم کے ردوبدل سے انکار کر دیا کہ سپریم کورٹ کے آج کے آرڈر کے بعد ہم ایسا نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، وہ قوم کے سامنے ہے اور جو کچھ ہونے جا رہا ہے، اس کے بارے میں بھی کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہے۔ اہل دین کی آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے جس کا سامنا کرنے کے لیے بہت زیادہ حوصلہ وتدبر اور حکمت ودانش کی ضرورت ہے۔ غازی عبدالرشید، ان کی والدہ محترمہ اور ان کے رفقا کی المناک شہادت ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی باعث رنج وغم ہے کہ ان کا تعلق اہل دین سے تھا اور وہ ایک غلط طریق کار پر بے جا اڑے رہنے کے

باوجود جن مقاصد کے لیے جدوجہد کررہے تھے، وہ درست تھے۔ اور یہ سانحہ ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی انتہائی صدمہ کا پہلو لیے ہوئے ہے کہ ہمارے محترم اور بزرگ دوست حضرت مولانا محمد عبداللہ شہیدؒ کا خاندان اپنے انتہائی قیمتی افراد سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جن افسران، سپاہیوں اور دیگر شہریوں نے جانیں دی ہیں، ان کی موت پر بھی ہم اسی طرح صدمہ سے دوچار ہیں۔ وہ بھی ہمارے مسلمان بھائی تھے، پاکستانی تھے اور اپنی ڈیوٹی پر تھے۔ ہم سب حضرات کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت اس صورت حال میں مسلسل باہمی مشاورت میں ہے۔ اس کی مجلس عامہ کے فیصلے ان سطور کی اشاعت تک آپ کے سامنے آچکے ہوں گے۔ ہمارا بنیادی ہدف اور دائرہ کار دینی تعلیم کا فروغ، اسلامی روایات کا تحفظ، دینی مدارس اور ان کی آزادی کی بقا اور عالم کفر کی نظریاتی، تہذیبی اور تعلیمی یلغار کا مقابلہ کرنا ہے۔ ان مقاصد کے لیے قانون اور دستور کے دائرے میں رہتے ہوئے جدوجہد کا ہر معروف طریقہ اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ ہمارا حق بنتا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں سے ہے۔ اس نئی صورت حال میں جہاں جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے مستقبل کا سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے، وہاں ملک بھر کے دینی مدارس کے جداگانہ تشخص اور آزادی وخود مختاری کو بھی دوبارہ سوالیہ نشان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم حوصلہ، تدبر، دانش، جرات، استقامت، اور تسلسل کے ساتھ اپنی جدوجہد کو جاری رکھ سکے تو دینی مدارس اس نئی آزمائش میں بھی سرخرو ہوں گے۔

قارئین کرام! جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اس کے اسباب وعوامل اور نتائج وعواقب کا تجزیہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر ایک عرصہ تک بحث ہوتی رہے گی اور ہم بھی حسب موقع اور حسب توفیق اس بحث میں اپنا حصہ ڈالیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مذاکرات کے دوران میں ہونے والے اہم واقعات کو تاریخ کے ریکارڈ میں لانا ضروری تھا۔ جو کچھ اس کالم میں تحریر کیا گیا ہے، وہ قوم کی اور تاریخ کی امانت تھی جو امانت ہی کے جذبہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے۔

خدا کرے کہ ہم اس قسم کے المیوں سے صحیح طور پر سبق حاصل کر سکیں اور یہ حادثات اپنی تمام تر المناکیوں کے باوجود ہمارے لیے مستقبل کی بہتر صورت گری کا باعث بن جائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

(۱۱ر جولائی ۲۰۰۷)

مذاکرات میں علما کا رویہ: چند توضیحات

حامد میر صاحب ہمارے محترم دوست ہیں، تجربہ کار صحافی اور تجزیہ نگار ہیں، میرے محسن ہیں کہ کسی درجے میں چھوٹی موٹی کالم نگاری کر رہا ہوں تو اس کا باعث وہی ہیں کہ انھوں نے اور مولانا اللہ وسایا قاسم شہید نے مل کر مجھے اس راہ پر لگایا تھا۔ میں سالہا سال تک روزنامہ اوصاف اسلام آباد میں حامد میر صاحب کی ٹیم کے ایک رکن کے طور پر ''نوائے قلم'' کے عنوان سے کالم لکھتا رہا ہوں اور جب انھوں نے روزنامہ اوصاف سے علیحدگی اختیار کی تو میں بھی اوصاف کے ساتھ رفاقت قائم نہ رکھ سکا۔

حامد میر صاحب انتہائی باخبر صحافیوں میں شمار ہوتے ہیں، حالات کا بہت خوبی کے ساتھ تجزیہ کرتے ہیں اور کسی بھی گفتگو کو اپنے ''ٹارگٹ'' تک لے جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ''بادشاہی'' پر بھی اتر آتے ہیں اور یہ ایک ایسا مقام ہے کہ اچھا بھلا آدمی بھی اس کے قریب سے گزرنے لگے تو بہت سے سوالیہ نشانوں کا ہدف بن جاتا ہے۔

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معاملات میں قوم کو حقائق اور حالات کے معروضی تناظر سے آگاہ کرنے میں جن صحافیوں نے دن رات محنت کی اور اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے بھرپور کام لیا، ان میں حامد میر صاحب سرفہرست ہیں جس پر پوری قوم کو ان کا شکرگزار ہونا چاہیے، لیکن انھوں نے اپنے ایک حالیہ کالم میں لال مسجد کے حوالے سے حکومت اور عبد الرشید غازی شہید کے ساتھ مذاکرات کرنے والے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے علمائے کرام کے بارے میں کچھ ایسی باتیں لکھی ہیں جو نہ صرف یہ کہ حقائق کے منافی ہیں بلکہ ایسی باتیں حامد میر کے درجے کے صحافی کے

شایان شان بھی نہیں ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :

۱۔ وفاق المدارس کے علما حکومت کے ساتھ مذاکرات میں سنجیدہ نہ تھے۔

۲۔ انھوں نے مذاکرات کے دوران میں کھانا منگوا کر کھانا شروع کر دیا۔

۳۔ وہ مذاکرات کے دوران میں قہقہے لگاتے رہے۔

۴۔ اور وہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو وفاق المدارس کے حوالے کرنے کے سوال پر مذاکرات چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

جہاں تک غیر سنجیدگی کا تعلق ہے، میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ مذاکرات کے دونوں فریق ہم سے جس قسم کی سنجیدگی کی توقع کر رہے تھے، ہم نے اس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ حکومتی حلقوں کے نزدیک سنجیدگی کا معیار یہ تھا کہ وفاق المدارس کی طرف سے اسلام آباد جانے والے علمائے کرام لال مسجد کے قریب ٹاکنگ پوائنٹ پر وزرا کے ساتھ کھڑے ہو کر لال مسجد میں موجود لوگوں سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے ہتھیار ڈالنے کی اپیل کریں جس کے لیے ہمیں بار بار کہا گیا، لیکن ہم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف عبدالرشید غازی شہید کے حمایتی حلقوں کے نزدیک سنجیدگی کا مطلب یہ تھا کہ ہم ان کے ساتھ کھڑے ہو کر تصادم کے اس ماحول میں حکومت کے خلاف محاذ آرا ہو جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ ہم اس کے لیے بھی تیار نہیں تھے، اس لیے کہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے اس تنازع کے آغاز سے جو موقف اختیار کر رکھا تھا اور جس پر ہم آج بھی قائم ہیں کہ طاقت کا استعمال کسی بھی فریق کی طرف سے درست نہیں ہے اور یہ تنازع مذاکرات کے ذریعے سے حل ہونا چاہیے، اس کے تحت ہم ان میں سے کوئی صورت بھی اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اب معلوم نہیں کہ محترم حامد میر صاحب سنجیدگی کے ان دونوں پہلوؤں میں سے کون سے پہلو کے حوالے سے وفاق المدارس العربیہ کے علمائے کرام کو غیر سنجیدہ قرار دے رہے ہیں۔

باقی رہی بات کھانا منگوانے کی تو وہ منگوایا گیا تھا اور کھایا بھی گیا تھا، لیکن منگوانے والے اور کھانے والے صرف علمائے کرام نہیں، بلکہ وزرائے کرام بھی ساتھ ہی تھے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آرڈر کس نے دیا تھا، لیکن میرا مشاہدہ یہ ہے کہ کھانے میں سب شریک تھے اور میں نے کسی کو کھانے

سے انکار کرتے نہیں دیکھا اور یہ کوئی عیب کی بات بھی نہیں تھی۔ جو لوگ شام پانچ بجے سے اس مذاکراتی عمل میں شریک تھے اور صبح تک انھوں نے اسی عمل میں شریک رہنا تھا، انھوں نے اگر اس دوران میں سادہ سے کھانا منگوا کر کھا لیا ہے تو اسے طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا بھی کوئی سنجیدگی کی بات نہیں ہے۔

یہی صورت قہقہہ کے حوالے سے بھی ہے۔ چودھری شجاعت حسین صاحب ان مذاکرات کے دوران میں بیڈ پر تھے اور میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ شام سات بجے سے رات اڑھائی بجے تک کے دوران میں کوئی ایسا موقع آیا ہو کہ کمرہ میں قہقہوں کی گونج اٹھی ہو اور چودھری صاحب لوگوں کو قہقہہ لگانے سے منع فرما رہے ہوں اور اگر پانچ چھ گھنٹے کی مسلسل گفتگو کے دوران میں مختلف نوع کی باتوں میں سے کسی بات پر کسی شخص کے منہ سے قہقہہ نکل بھی گیا ہے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اسے باقاعدہ طعن وتشنیع کا عنوان بنایا جائے اور ملک کے بڑے بڑے علماے کرام پر اس کی پھبتی کسی جائے۔

البتہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو وفاق المدارس کے حوالے کرنے کے سوال پر مذاکرات کو چھوڑ کر واپس آ جانے کی بات واقعتاً سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے، لیکن یہ بات خلاف واقعہ ہے، اس لیے کہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو وفاق المدارس کے سپرد کرنے کی بات وفاق المدارس کے علما کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ یہ غازی عبدالرشید شہید کی شرط تھی جو اس سے بہت پہلے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کے ساتھ غازی شہید کی گفتگو کے دوران میں سامنے آئی تھی اور وہ ان دو اداروں سے اسی شرط پر دست بردار ہونے کے لیے تیار ہوئے تھے کہ انھیں وفاق المدارس کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کے باوجود وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے اسی مجلس میں کہہ دیا تھا کہ ہمیں اس بات سے دلچسپی نہیں ہے کہ ان دونوں مدارس کا انتظام وفاق المدارس ہی کے حوالے کیا جائے، بلکہ صرف اس بات سے دلچسپی ہے کہ یہ دونوں مدرسے قائم رہیں اور ان کی مدرسے کی حیثیت تبدیل نہ ہو۔ اگر انھیں وفاق المدارس کے حوالے نہیں کیا جاتا تو اسلام آباد اور راول پنڈی کے علماے کرام کی کمیٹی بنا کر اس کے حوالے کر دیا جائے، بلکہ ہم اس کے لیے بھی تیار

ہیں کہ چودھری شجاعت حسین صاحب کو جامعہ حفصہ کا مہتمم بنا دیا جائے، لیکن مدرسہ کی حیثیت اور کردار تبدیل نہ کیا جائے۔

یہ ساری باتیں ان مذاکرات کے دوران میں ہوئی ہیں اور چودھری شجاعت حسین صاحب کے سامنے ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود اگر یہ کہا جاتا ہے کہ وفاق المدارس کے علمائے کرام جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو تحویل میں نہ دیے جانے پر مذاکرات چھوڑ کر چلے گئے تھے تو اسے ''بادشاہی'' کے سوا اور کس عنوان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

اس سلسلے میں ایک اور بات جو حامد میر صاحب نے تو نہیں لکھی لیکن بعض اور دوستوں نے سوال کیا ہے کہ رات اڑھائی بجے علمائے کرام ٹاکنگ پوائنٹ سے واپس کیوں چلے گئے جبکہ مذاکرات ان کے بعد بھی مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے سے مزید ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہے؟ یہ بات درست ہے کہ جب ہم سے یہ کہا گیا کہ ایوان صدر سے لائے جانے والے مسودہ میں کوئی ردوبدل نہیں ہوگا اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کا ہاں یا نہ میں جواب دیا جائے، اس کے بعد غازی عبدالرشید شہید کو یہ مسودہ فون پر سنایا گیا تو انھوں نے اسے قبول نہ کرنے کا حتمی فیصلہ سنا دیا تو ہمارے لیے ان مذاکرات کو مزید جاری رکھنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہی تھی اور اس موقع پر ہم نے محسوس کیا کہ دونوں فریق اب مزید کوئی بات ہمارے بغیر صرف مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے واسطے سے کرنا چاہتے ہیں تو ہم نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ فوراً وہاں سے چلے جائیں تا کہ وہ گفتگو اگر آگے بڑھتی ہے تو ہماری طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب ہم وہاں سے اٹھے ہیں تو کسی نے بھی ہمیں یہ نہیں کہا کہ گفتگو ابھی جاری ہے، اس لیے آپ تھوڑی دیر اور رکیں، جس سے ہمارا یہ اندازہ اور پختہ ہو گیا کہ اب یہ حضرات ہمارے بغیر اور صرف مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ ہم جب اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو ہم نے ایک فیصلہ اور کیا کہ چونکہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل کے ذریعے سے گفتگو کا ایک دور ابھی چل رہا ہے اور ہماری خواہش ہے کہ کسی نہ کسی طرح مذاکرات کا کوئی مثبت نتیجہ نکل آئے، اس لیے ہم سردست میڈیا سے کوئی بات نہیں کریں گے تا کہ ہماری کوئی بات خدانخواستہ اس گفتگو پر اثر انداز نہ ہو اور گفتگو ناکامی سے دوچار

نہ ہو جائے۔ اسی وجہ سے ہم نے اپنے موبائل فون بند کر لیے اور کمرے بھی بند کر کے نماز فجر ادا کرنے کے بعد سو گئے۔ اسے اگر حامد میر صاحب غیر سنجیدگی سے تعبیر فرماتے ہیں تو ان سے رائے کا حق نہیں چھینا جا سکتا، لیکن ہم بحمد اللہ تعالیٰ پوری طرح مطمئن ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا، پورے خلوص اور شرح صدر کے ساتھ کیا اور اس الم ناک خونریزی کو روکنے کی اپنی بساط کی حد تک ہر ممکن کوشش کی۔

(۱۷؍ جولائی ۲۰۰۷)

لال مسجد کا سانحہ اور ہماری ذمہ داریاں

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے سانحے نے پوری قوم کو غم اور صدمے سے دوچار کر دیا ہے اور جس شخص کے سینے میں بھی گوشت کا دل ہے، وہ اس المیے پر مضطرب اور بے چین ہے۔ ۱۰ر جولائی کی صبح کو عین اس وقت جبکہ حکومت اور غازی عبدالرشید شہید کے درمیان مذاکرات ایک مثبت نتیجے پر پہنچ چکے تھے، ان مذاکرات کو ملک کی مقتدر شخصیت نے ویٹو کر دیا اور پھر مذاکرات کا دور ختم ہوتے ہی جس بے دردی اور سنگ دلی کے ساتھ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے اندر موجود افراد، بالخصوص طالبات اور بچوں کو مسلح آپریشن کا نشانہ بنایا گیا، وہ ملک کی تاریخ میں وحشت اور درندگی کے ایک افسوس ناک باب کے عنوان کے طور پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ تاریخ میں چنگیز خان، ہلاکو خان، مسولینی اور ہٹلر کے مظالم کی داستانیں پڑھتے تھے تو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کوئی انسان اس انتہا تک بھی جا سکتا ہے، مگر اکیسویں صدی کے نام نہاد مہذب دور میں جس طرح لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں بے شمار افراد، عورتوں اور بچوں کو بھنتے اور کٹتے اور جلتے ہوئے دیکھا گیا ہے، اس نے وحشت و بربریت کے ان نامور ہیروز کو بھی شرما کر رکھ دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت واقعہ ہے کہ ۹ اور ۱۰ جولائی کی درمیانی شب تک وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے راہ نماؤں کے ساتھ وزیر اعظم پاکستان، ان کے متعدد وزرا اور حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین کے مذاکرات کے نتیجے میں ایک ایسے فارمولے پر اتفاق رائے ہو چکا تھا جسے ٹیلی فون پر سننے کے بعد غازی عبدالرشید شہید نے بھی اس سے اتفاق کر لیا تھا اور اس رات چند ایسے لمحات ضرور آئے تھے جب فریقین میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع کے عملی حل کے

سلسلے میں کوئی اصولی اختلاف باقی نہیں رہ گیا تھا، لیکن خدا جانے کس منحوس کی نظر بد آڑے آئی کہ اسی رات کو صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اسلام آباد دھماکوں سے لرز رہا تھا اور لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے در و دیوار گولیوں اور بموں سے چھلنی ہو رہے تھے۔

راقم الحروف اس رات اسلام آباد میں تھا اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے راہ نماؤں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، ڈاکٹر عادل خان اور دیگر حضرات کے ہمراہ چودھری شجاعت حسین، جناب محمد اعجاز الحق، جناب محمد علی درانی اور جناب طارق عظیم کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھا کہ اچانک ان مذاکرات میں ڈیڈ لاک پیدا کیا گیا اور پھر اچانک مسلح آپریشن کے آخری راؤنڈ کا پوری شدت کے ساتھ آغاز کر دیا گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قوم کے سامنے ہے اور قوم کے دل و جگر پر لگنے والا یہ زخم خدا جانے کب تک رستا رہے گا۔

سانحہ لال مسجد کے اسباب و عوامل کیا تھے اور معاملات کو اس افسوس ناک مرحلے تک پہنچانے میں کس کس کا کیا کردار ہے؟ اس کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب جسٹس افتخار محمد چودھری نے فل بنچ قائم کر دیا ہے جو اپنے کام کا آغاز کر چکا ہے اور جوں جوں اس کی کارروائی آگے بڑھے گی، بہت سے چہرے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے اور کئی سربستہ راز منظر عام پر آئیں گے، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہٹ کر بھی اس صورت حال کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور خاص طور پر دینی حلقوں کے سوچنے کا مقام ہے کہ کیا اس حوالے سے انھیں جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا یا جو کردار وہ ادا کر سکتے تھے، کیا ان کا ضمیر اس کردار کی ادائیگی کے بارے میں مطمئن ہے؟ یہ بہت حساس سوال ہے جس کا پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ نہ لیا گیا تو آئندہ اس قسم کے المیوں کو روکا نہیں جا سکے گا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں غزوۂ احد کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خود زخمی ہوئے بلکہ ستر صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا اور مسلمانوں کی واضح فتح وقتی طور پر ہزیمت میں بدل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کے اسباب و عوامل کی نشان دہی کی ہے، اس پر

ڈانٹ ڈپٹ کی ہے اور پھر معافی کا اعلان بھی فرمایا ہے لیکن ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اپنی ناکامی اور ہزیمت کے اسباب کو ضرور دیکھو، عوامل کی نشان دہی کرو اور کسی رعایت کے بغیر جس کی جو غلطی ہے، اسے اس سے آگاہ کرو تاکہ آئندہ اس سے بچا جا سکے۔

قرآن کریم کا یہ اسلوب ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے شہدا کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا اپنا احتساب بھی کریں اور اس حوالے سے اپنی اپنی کوتاہیوں کا ادراک کرتے ہوئے ان کی تلافی کی کوشش کریں۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف مسلح آپریشن کی مذمت کرتے ہیں، اس دوران میں جام شہادت نوش کرنے والوں کے لیے بلندئ درجات کی دعا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وفاق المدارس العربیہ کے ان مطالبات کی مکمل حمایت کرتے ہیں کہ:

o کھلی عدالتی انکوائری کے ذریعے سے لال مسجد کے سانحے کے اسباب وعوامل اور ذمہ دار عناصر کو بے نقاب کیا جائے۔

o شہدا کی لاشیں ان کے ورثہ کے حوالے کی جائیں۔

o گم شدگان اور لاپتہ افراد کو بازیاب کیا جائے اور ان کے اہل خاندان کو اعتماد میں لیا جائے۔

o جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے دینی مدرسے کے طور پر باقی رہنے کی ضمانت دی جائے اور ان کی حیثیت تبدیل نہ کرنے کا واضح اعلان کیا جائے۔

o تمام جھوٹے مقدمات واپس لیے جائیں اور مولانا عبدالعزیز سمیت تمام گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے۔

o اس سانحہ کی آڑ میں ملک کے دینی مدارس کو دھمکیاں دینے کا سلسلہ بند کیا جائے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، اگست ۲۰۰۷)

مذہبی شدت پسندی، حکومت اور دینی سیاسی جماعتیں

جامعہ حفصہ اور لال مسجد اسلام آباد کے خلاف سرکاری فورسز کے مسلح آپریشن نے پورے ملک کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ایک عرصہ سے مختلف حلقوں کی طرف سے یہ کوشش جاری تھی کہ کسی طرح یہ تصادم رک جائے اور خونریزی کا وہ المناک منظر قوم کو نہ دیکھنا پڑے جس نے ملک کے ہر فرد کو رنج و صدمہ کی تصویر بنا دیا ہے، لیکن جو ہونا تھا وہ ہوا، بہت برا ہوا اور بہت برے طریقے سے ہوا۔اس سے کچھ لوگوں کو ضرور تسکین حاصل ہوئی ہوگی جو حکومت کی رٹ بحال کرنے کے ساتھ ساتھ دہشت اور رعب و دبدبہ مسلط کرنا بھی ضروری سمجھ بیٹھے تھے اور ان کا خیال تھا کہ طاقت اور اسلحہ کا بے دریغ استعمال کیے بغیر اور آگ اور خون کا کھیل کھیلے بغیر شاید حکومت کی رٹ کا وقار قائم نہیں رہے گا۔چند افراد ضرور ایسے ہوں گے، لیکن بحیثیت مجموعی پوری قوم غم زدہ ہے، افسردہ ہے، مضطرب اور بے چین ہے کہ بہت سے بے گناہوں کے لاشے تڑپے ہیں، بچوں اور عورتوں کا خون بہا ہے اور یہ سب کچھ اللہ کے گھر میں ہوا ہے اور ایک دینی درس گاہ میں ہوا ہے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک سرکاری چلڈرن لائبریری پر جامعہ حفصہ کی طالبات کے قبضہ کے ساتھ جب اس تنازع کا آغاز ہوا تھا اور اس کے بعد ایک مبینہ قحبہ خانہ اور پھر مساج پارلر کے خلاف کارروائی نے اس معاملہ کو آگے بڑھایا تھا تو ہم نے اسی وقت یہ عرض کر دیا تھا کہ ایک مسلمان ملک کے اندر حکومت وقت کے خلاف اس قسم کے تصادم کے ماحول اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی حمایت نہیں کی جا سکتی اور مقاصد کتنے ہی نیک اور اچھے کیوں نہ ہوں، ان کے لیے اس طرز کی جدوجہد کو سند جواز فراہم نہیں کی جا سکتی۔اس پر ملک بھر کے جمہور علمائے کرام کا کم و بیش اجماع منعقد ہو گیا تھا، مگر اس کی پروا کیے بغیر

معاملات کو اسی رخ پر آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسری طرف ملک کی سنجیدہ دینی قیادت نے حکومت پر مسلسل زور دیا کہ وہ طاقت کے استعمال سے گریز کرے، جائز مطالبات منظور کرنے کی طرف توجہ دے، ان اسباب وعوامل کو دور کرنے کی کوشش کرے جن کے ردعمل میں شدت کی یہ صورت سامنے آئی ہے اور مذاکرات کے ذریعے سے مسئلے کو حل کرنے کا راستہ نکالے، لیکن حکومت نے بھی اس کے لیے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس کی غیر سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ان جائز مطالبات میں سے کسی ایک کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا جن کی بنیاد پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ شدت کی اس انتہا تک جا پہنچی تھی۔

ہمیں اس بات سے اتفاق ہے کہ اگر حکومت اسلامی نظام کے نفاذ، اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کرنے، حدود شرعیہ میں کی گئی ترامیم پر نظر ثانی اور فحاشی کے مبینہ مراکز کو بند کرنے میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی سنجیدگی سے متوجہ ہو جاتی تو اس سلسلے میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے رویے میں پائی جانے والی شدت کو کم کیا جا سکتا تھا اور ہم لال مسجد کے خطیب مولانا عبد العزیز کی اس بات سے بھی متفق ہیں جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے طریق کار سے اختلاف کرنے والے ان جائز مطالبات کے لیے صحیح طریق کار سے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟ مولانا عبد العزیز اور غازی عبد الرشید شہید کے طریق کار سے ہم نے بھی اختلاف کیا تھا اور اب بھی ہم اسے غلط ہی سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا اور مسلح تصادم کا ماحول پیدا کرنا ہمارے نزدیک شرعاً اور اخلاقاً کسی بھی لحاظ سے درست نہیں ہے، لیکن مولانا عبد العزیز کے اس سوال کا آخر کیا جواب ہے کہ ان کے طریق کار سے اختلاف کرنے والوں نے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ اور فحاشی ومنکرات کے سدباب کے لیے صحیح طریق کار پر مبنی کون سی جدوجہد کا اہتمام کیا ہے؟ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ معاملات کو اس رخ تک پہنچانے میں جہاں اسلامی نظام کے معاملے میں حکومت کی سرد مہری کارفرما ہے، وہاں اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کی داعی دینی سیاسی جماعتیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں کہ ان کی بے عملی اور تغافل

نے وہ خوف ناک خلا پیدا کر دیا ہے جس کو پر کرنے کے لیے تشدد اور بغاوت کی تحریکات آگے بڑھ رہی ہیں اور یہ قانونِ فطرت ہے کہ خلا جس قدر گہرا ہو، اس کی جگہ لینے والی قوتیں اسی قدر شدت اور تیزی کے ساتھ لپکتی ہیں اور بسا اوقات آندھی اور طوفان کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔

جہادِ افغانستان کے بعد یہ بات حکومت اور دینی سیاسی جماعتوں، دونوں سے توجہ کی طالب تھی کہ جن ہزاروں افراد نے پاکستان سے جا کر افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف عملی جنگ لڑی ہے، وہ صرف اسلحہ چلانے کا ہی عملی تجربہ نہیں رکھتے بلکہ اسلام کی بالادستی اور نفاذِ اسلام کے مخلصانہ جذبے سے بھی سرشار ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے اور وہ ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ انھیں ملک وقوم کا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہوئے نہ حکومت نے ان کے جذبات و رجحانات کو اسلام اور پاکستان کے لیے مثبت رخ پر قائم رکھنے کی کوئی پالیسی اپنائی اور نہ ہی دینی سیاسی جماعتوں نے انھیں اپنانے اور اپنی جدوجہد میں شریک کرنے کی طرف توجہ دی بلکہ انھیں اپنا حریف اور اپنے لیے خطرہ تصور کیا گیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے لیے جو نیا ماحول کھڑا کیا گیا، وہ ان کی کردار کشی، توہین، طنز واستہزا، اور تحقیر وحوصلہ شکنی سے عبارت تھا۔ پھر اس فضا میں ان کے سامنے افغانستان میں امریکی فوجیں اتریں، طالبان کی حکومت کو قوت کے ساتھ تہس نہس کر دیا گیا اور پاکستان میں دینی شعائر اور اسلامی روایات واقدار کو پامال کرنے کی پالیسیاں آگے بڑھنے لگیں تو ان کا غصہ اور نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور وہی غصہ ونفرت مجتمع ہو کر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

ہم نے حکومت وقت کے ساتھ مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید کے تصادم اور محاذ آرائی کے طرزِ عمل کو غلط قرار دیا ہے اور فی الواقع اسے غلط سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی شدید دکھ ہے کہ ان بھائیوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ خود اپنی دینی وعلمی قیادت سے بھی بغاوت کی اور ان کی مشاورت وہدایات کو قبول نہ کیا، لیکن اس کا یہ پس منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ اسلامی نظام اور دینی شعائر واقدار کے بارے میں حکومتی حلقوں اور اداروں کی منافقانہ پالیسی کا آخری جذباتی ردعمل یہی ہو سکتا تھا اور غازی برادران کے دل میں یہ بات یقین کے درجے میں بیٹھ چکی تھی کہ دینی سیاسی

جماعتوں نے اپنے لیے معروضی سیاست اور اقتدار کی اکھاڑ پچھاڑ کو ہی آخری منزل سمجھ لیا ہے اور ان سے نفاذ اسلام کے لیے کسی موثر جدوجہد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ہمارے نزدیک یہ دو عوامل ہیں جنھوں نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو حکومت کے خلاف ایک مسلح مورچہ بنا دیا اور بات لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف سرکاری آپریشن پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ملک بھر میں ہونے والے ہنگاموں اور خودکش حملوں نے لال مسجد کی اس بغاوت کا دائرہ دور دور تک وسیع کر دیا ہے۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے کہ ۱۴ر جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سرگودھا میں ایک نوجوان نے بینک ڈکیتی کے دوران میں زخمی حالت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس نے بینک پر ڈاکہ اس لیے ڈالا ہے تاکہ رقم حاصل کر کے لال مسجد کا بدلہ لینے اور ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد منظم کرنے کے لیے کام کر سکے، یعنی اس نے ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد کے لیے بینک ڈکیتی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے، بہت بڑا المیہ ہے اور اس قسم کے المیے مایوسیوں سے جنم لیا کرتے ہیں۔ جب لوگوں کو ان کے جائز مطالبات اور جذبات کا صحیح جگہ سے جواب نہیں ملتا تو وہ اس کی تسکین کے لیے متبادل ذرائع اختیار کرتے ہیں اور یہ متبادل ذرائع ضروری نہیں کہ صحیح بھی ہوں۔

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جس کا وجود اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور اس کے دستور میں اسلامی نظام کی عمل داری اور اسلامی معاشرے کے قیام کی ضمانت دی گئی تھی۔ جب ایک مسلم نوجوان اس سلسلے میں حکومت کی سرد مہری اور حکومتی اداروں کا منفی طرز عمل دیکھتا ہے تو اس کی نگاہیں بے ساختہ دینی جماعتوں کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہ کیا کر رہی ہیں اور حکومتی طرز عمل کا رخ تبدیل کرانے کے لیے کس سنجیدگی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اگر اسے دینی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد اور تحریک میں اپنے جذبات کی تسکین کا سامان مل جائے تو وہ وہاں رک جائے گا اور خود کو ان کے حوالے کر دے گا، لیکن اگر اسے وہاں بھی امید کا کوئی پہلو دکھائی نہ دے اور ہر طرف وقتی مفادات اور مصلحتوں کا ہی ماحول ملے تو پھر اس کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے اور اسلام کی بالادستی اور فحاشی و بے حیائی سے معاشرہ کو پاک کرنے کا خیال اپنے ذہن سے

نکال دے اور یا پھر اس کے لیے اپنا راستہ خود نکالے اور جو کچھ وہ اس کے لیے کر سکتا ہے، اس کی منصوبہ بندی کرے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے ہزاروں نوجوان جو نفاذ اسلام کے مخلصانہ جذبہ سے بہرہ ور ہیں اور اسلحہ کی ٹریننگ بھی رکھتے ہیں، گزشتہ ایک عشرے کے دوران میں اسی تجربے سے گزرے ہیں اور اب وہ اس تجربے کے آخری مرحلے میں ہیں جس کی ایک جھلک لال مسجد میں پوری قوم نے دیکھ لی ہے اور اگر حکومت اور دینی جماعتوں نے اب بھی اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لیا اور ان مخلص اور پر جوش نوجوانوں کے جذبات کو مثبت رخ دینے کی کوئی معقول کوشش نہ کی تو لال مسجد اس قضیہ کی انتہا نہیں ہوگی بلکہ خدانخواستہ ابتدا ثابت ہو سکتی ہے۔

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے تنازع میں اپنی جانوں کا نذرانہ دینے والے شہدا کے لیے ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انھیں جوار رحمت میں جگہ دیں۔ ہمیں سرکاری فورسز کے ان نوجوانوں سے بھی گہری ہمدردی ہے جنھوں نے اپنی جانیں پیش کیں۔ وہ ڈیوٹی پر تھے اور فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت تمام شہدا کو جوار رحمت میں جگہ دیں، زخمیوں کو صحت عطا فرمائیں، پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازیں اور ہم سب کو بحیثیت قوم اس سانحہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ملک وقوم کے مستقبل کی بہتر صورت گری کی توفیق دیں۔ آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، اگست ۲۰۰۷)

سانحہ لال مسجد اور احتجاج کا موزوں طریقہ کار

گزشتہ ہفتے گوجرانوالہ شہر کے کچھ سرکردہ علمائے کرام میرے ہاں جمع ہوئے کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے سانحہ کے حوالے سے کوئی موثر احتجاجی پروگرام ہونا چاہیے اور ہمیں اس سلسلے میں اپنی آواز بلند کرنی چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس بات سے مکمل اتفاق ہے اور سانحہ لال مسجد میں جو کچھ ہوا ہے، میں خاموش تماشائی کے طور پر دیکھتے رہنے کے حق میں نہیں ہوں مگر سوال یہ ہے کہ اس کا پلیٹ فارم کون سا ہے اور معروضی صورت حال میں کس عنوان اور فورم سے احتجاج منظّم کرنا اور آواز بلند کرنا زیادہ موثر ہوسکتا ہے؟ بعض دوستوں نے کہا کہ متحدہ مجلس عمل یا جمعیت علمائے اسلام کو اس احتجاجی پروگرام کا داعی بننا چاہیے۔ میں نے گزارش کی کہ مجھے اس بات سے بھی مکمل اتفاق ہے، لیکن قومی سیاست کے اتار چڑھاؤ نے جو صورت اختیار کر لی ہے، اس کے پیش نظر ایم ایم اے یا جمعیت علمائے اسلام اس جدوجہد کی ذمہ داری شاید قبول نہ کر سکے اور اسی وجہ سے ان دونوں کی قیادت آگے آنے سے ہچکچا رہی ہے۔ کچھ دوستوں کا کہنا تھا کہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کو تحریک کا اعلان کر کے ملک بھر کے لاکھوں طلبہ کو سڑکوں پر لے آنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ وفاق المدارس نہ تو کوئی سیاسی جماعت ہے اور نہ ہی وہ تحریکی فورم ہے۔ وہ دینی مدارس کے امتحانی اور تعلیمی امور پر کنٹرول کرنے والا ایک بورڈ ہے اور اسے تحریکی پلیٹ فارم کی شکل دینے سے ایک بورڈ کے طور پر اس کا سارا نظام تلپٹ ہو جائے گا جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوگا، اس لیے میں وفاق المدارس کے عنوان سے کسی تحریکی پروگرام کے حق میں نہیں ہوں اور وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں اسی موقف کا میں نے دوٹوک اظہار کیا ہے، البتہ

چونکہ یہ معاملہ ایک دینی مدرسے کے حوالے سے ہے، اس لیے وفاق کو اس سلسلے میں اپنے موقف کا اظہار کرنا چاہیے اور اس کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے تمام ممکنہ اور معروف ذرائع استعمال کرنے چاہییں مگر اسے عوامی تحریک اور احتجاجی جدوجہد کا رنگ نہیں دینا چاہیے کیونکہ یہ کام دینی سیاسی جماعتوں کا ہے اور انھی کو سجتا ہے۔ اردو کا ایک معروف محاورہ ہے کہ ''جس کا کام اسی کو ساجھے، اور کرے تو ٹھینگا باجے''۔

اس موقع پر یہ سوال ہوا کہ متحدہ مجلس عمل یا جمعیت علماے اسلام اس مرحلے میں کسی تحریک کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ اسے تحریکی فورم نہیں بننا چاہیے تو پھر یہ گاڑی کیسے چلے گی؟ میں نے عرض کیا کہ ہمارے اکابر ایسے مواقع پر ان کاموں کے لیے ایک الگ دینی محاذ کا اہتمام کیا کرتے تھے جس میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ایک یہ کہ اس میں تمام دینی مکاتب فکر کی نمائندگی موجود ہو اور دوسری یہ کہ وہ محاذ حکومت اور اپوزیشن کے تنازع اور ملک میں موجودہ سیاسی کشمکش میں فریق نہ ہو۔ قادیانیت کے خلاف تحریک کے لیے یہی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی۔ ۱۹۵۳ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۸۴ء کی تحریکات ختم نبوت میں اسی حکمت عملی کے تحت جدوجہد کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا گیا تھا اور اب بھی اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ ملک کی سیاسی کشمکش سے الگ تھلگ رہتے ہوئے تمام دینی مکاتب فکر کے ذمہ دار نمایندوں پر مشتمل ایک متحدہ دینی محاذ تشکیل دیا جائے جو لال مسجد کے شہدا کے جائز مطالبات کو لے کر آگے بڑھے اور ملک بھر میں اس سلسلے میں پائے جانے والی دینی جذبات کی قیادت اور راہ نمائی کی کوئی صورت نکالے۔ اس کے سوا اس جدوجہد کو آگے بڑھانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ دوستوں نے اس بات سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ گوجرانوالہ میں مقامی سطح پر اس سلسلے میں تجربہ کیا جائے، چنانچہ ''تحفظ مدارس دینیہ'' کے نام پر ایک رابطہ کمیٹی تشکیل دے کر ۲۲ جولائی کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ایک مشترکہ کنونشن طلب کر لیا گیا جس میں نہ صرف یہ کہ دیوبندی مکتب فکر کی کم وبیش تمام اہم تنظیموں کے ذمہ حضرات نے شرکت کی، بلکہ جمعیۃ علماے اسلام، جمعیۃ اہل حدیث، تحریک انصاف، پاکستان مسلم لیگ (ن) کے راہ نماؤں اور ان کے علاوہ شہر کی تاجر

تنظیموں کے نمایندوں نے بھی خطاب کیا اور لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف مسلح سرکاری آپریشن کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان مطالبات کی بھرپور حمایت کی جو اس سلسلے میں دینی حلقوں کی طرف سے کیے جارہے ہیں۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث اس بارے میں اس سے قبل پیش قدمی کرتے ہوئے شہر میں باپردہ خواتین کا ایک احتجاج جلوس نکال چکی تھی جس میں ہزاروں خواتین نے جی ٹی روڈ پر لال مسجد کے سانحہ میں بے گناہ افراد اور خواتین کی الم ناک شہادت پر، پر جوش اور پر امن احتجاج کیا، چنانچہ کنونشن میں طے پایا کہ ۲۵ رجولائی بدھ کو شہر میں مکمل ہڑتال کی جائے گی اور شہر کی سڑکوں پر احتجاجی جلوس نکالا جائے گا۔

میرے ذمے لگا کہ علمائے کرام کے ایک وفد کے ہمراہ شہر کی تاجر تنظیموں سے رابطہ کروں اور ان سے گزارش کروں کہ جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے خلاف مسلح آپریشن کی مذمت، ہزاروں افراد کی مبینہ شہادت، سینکڑوں افراد اور طالبات کی گم شدگی، جامعہ حفصہ کو مسمار کرنے اور دیگر دینی مدارس کے خلاف کارروائی کی دھمکیوں کے خلاف مکمل ہڑتال کر کے گوجرانوالہ کے شہریوں کی طرف سے اجتماعی احتجاج ریکارڈ کرائیں۔ میں نے مولانا سید عبدالمالک شاہ، مولانا مشتاق احمد چیمہ، بابر رضوان، حافظ حمید الدین اعوان اور دیگر دوستوں کے ہمراہ مارکیٹوں کا دورہ کیا اور تاجر راہ نماؤں سے بات کی تو انھوں نے بہت حوصلہ افزا ردعمل ظاہر کیا، بلکہ بہت سے تاجر دوستوں نے شکوہ کیا کہ آپ لوگ بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ آپ حضرات کو یہ کام سانحہ لال مسجد کے رونما ہوتے ہی کر دینا چاہیے تھا، بلکہ تاجر دوستوں کے ایک اجلاس میں ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ جب ۱۰ جولائی کی صبح کو مذاکرات ناکام ہو گئے تھے اور آپ لوگ واپس آ گئے تھے تو آپ حضرات نے اس وقت کال کیوں نہیں دی؟ میں نے عرض کیا کہ اس وقت ہم دو وجہ سے فوری کال نہیں دے سکے۔ ایک یہ کہ ہمارے مذاکرات ناکام ہونے کے بعد ابھی ایک اور ذریعے سے مذاکرات چل رہے تھے اور ہم اس گفتگو کے دوران میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے اس پر منفی اثر پڑے اور دوسرا اس وجہ سے کہ رات اڑھائی بجے ہماری گفتگو ناکام ہو گئی اور اس کے صرف ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مسلح

آپریشن پوری قوت کے ساتھ شروع ہوگیا۔ ہم کس کو کال دیتے اور کس بات کی کال دیتے؟ پھر ہم وفاق المدارس کے فورم سے کوئی کال دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ وفاق کوئی تحریکی قوت نہیں ہے اور وفاق کے راہ نما صرف اس لیے اسلام آباد گئے تھے کہ فریقین کے درمیان مذاکرات کا رابطہ بحال کرا کے تصادم کو روکنے اور مسئلے کے پرامن حل کے لیے کوئی راستہ نکالیں اور اس طور پر ان کی حیثیت فریق کی نہیں بلکہ مصالحت کنندہ کی تھی۔

بہر حال تاجر راہ نماؤں نے مختلف اجلاسوں میں ہمارے احتجاجی پروگرام کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے اور ہڑتال کو کامیاب بنانے کا وعدہ کرتے ہوئے بھی مختلف قسم کے جذبات کا اظہار کیا جس سے اندازہ ہوا کہ ملک کا عام شہری کس انداز سے سوچتا ہے اور سانحہ لال مسجد کے حوالے سے ملک کے شہریوں کے جذبات کیا ہیں؟ ایک تاجر دوست نے مولانا عبدالعزیز کا یہ سوال دہرایا کہ آپ حضرات بار بار کہتے آ رہے ہیں کہ لال مسجد والوں کے مطالبات درست ہیں، لیکن طریق کار غلط ہے مگر اس طریق کار کو غلط قرار دینے والوں نے صحیح مطالبات کے لیے طریق کار کے مطابق کون سی جدوجہد کا اہتمام کیا ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ، فحاشی اور بے حیائی کے مراکز کے خاتمے، اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کی دوبارہ تعمیر اور حدود شرعیہ میں کی گئی نئی ترامیم کو ختم کرانے کے لیے صحیح طریق کار کے مطابق کون سی جدوجہد موجود ہے جو لوگوں کو نظر آ رہی ہو اور عام لوگ اس میں شریک ہو کر اپنے دلوں میں اطمینان محسوس کر رہے ہوں کہ وہ ملک میں نفاذ اسلام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایک اور تاجر دوست کے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ جب صدر پرویز مشرف نے مصالحتی فارمولا مسترد کر دیا تھا تو بظاہر گفتگو اس نکتے پر منقطع ہوئی تھی کہ مولانا عبد الرشید غازی شہید رحمہ اللہ گرفتاری دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور حکومت انھیں ہر صورت میں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ اس تاجر دوست کے نزدیک، جو ایک مارکیٹ کے سیکرٹری ہیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ مذاکرات دراصل مولانا عبدالرشید غازی شہید رحمہ اللہ کے انکار پر ختم ہوئے تھے اور اگر وہ اپنی گرفتاری کے لیے تیار ہو جاتے تو حکومت کے لیے اس آپریشن کا کوئی جواز باقی نہ رہ جاتا اور اتنی

جانیں اس سانحہ کی نذر نہ ہوتیں۔ اس تاجر دوست نے مجھ سے بار بار پوچھا کہ اگر مولانا عبدالرشید غازی گرفتاری دے دیتے تو کیا ہو جاتا؟ ان کے بھائی بھی تو گرفتار ہیں۔ میں دیانت داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا اور میں نے بڑی مشکل کے ساتھ گول مول جواب دے کر انھیں چپ کرایا۔

ان ملے جلے جذبات اور خیالات کے باوجود گوجرانوالہ کے شہریوں اور تاجر تنظیموں نے ۲۵ جولائی کی ہڑتال کی حمایت کی اور اسے مکمل طور پر کامیاب بنا کر یہ پیغام دیا کہ لال مسجد والوں سے لوگوں کو کتنی ہی شکایات کیوں نہ ہوں، مگر ان کے خلاف جس درندگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے، جس تشدد، جبر اور بربریت کے ساتھ معصوم لوگوں کا خون بہایا گیا ہے اور اس وحشیانہ ظلم وتشدد کے نشانات مٹانے کے لیے جو حرکتیں مسلسل کی جا رہی ہیں، ملک کا ہر شہری اس سے نفرت کرتا ہے اور شدید غم وغصہ کی حالت میں ملی غیرت اور دینی حمیت کے اس اجتماعی اور پرجوش اظہار پر گوجرانوالہ کے شہریوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور انتظار میں ہوں کہ بارش کا دوسرا قطرہ بننے کے لیے ملک کا کون سا شہر آگے آتا ہے؟

(روزنامہ اسلام، ۳۱ جولائی ۲۰۰۷)

وفاق المدارس العربیہ عوام کی عدالت میں

رجب ہمارے ہاں دینی مدارس کے تعلیمی نظام میں سال کا آخری مہینہ ہوتا ہے۔شوال کے وسط سے شروع ہوکر رجب کے وسط تک عام طور پر تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔اس کے بعد امتحانات ہوتے ہیں اور پھر شوال کے وسط تک کے لیے سالانہ تعطیلات ہوجاتی ہیں۔کچھ عرصے سے ان دونوں بخاری شریف کے اختتام کی تقریبات کثرت کے ساتھ ہونے لگی ہیں۔ بخاری شریف درس نظامی کے تعلیمی نصاب میں آخری کتاب ہے جس کی تعلیم مکمل ہونے کے ساتھ ہی طالب علم امتحان میں کامیابی کی صورت میں سند فراغت کے مستحق ہو جاتے ہیں اور انھیں فارغ التحصیل قرار دے کر دستار فضیلت سے نوازا جاتا ہے۔

ان دنوں بخاری شریف کے اختتام کی تقریبات زوروں پر ہیں اور خود مجھے بھی ان کے لیے مختلف شہروں میں جانا پڑتا ہے۔ وہاڑی، فیصل آباد، سرگودھا، جھنگ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، راول پنڈی اور دیگر بہت سے اضلاع میں اس حوالے سے متعدد تقریبات میں شریک ہو چکا ہوں، مگر اس سال ان تقریبات میں بخاری شریف اور علم حدیث کے روایتی موضوعات سے زیادہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معاملات زیر بحث ہیں۔ ہر جگہ ان کے بارے میں سوالات ہو رہے ہیں، شبہات واشکالات پیش کیے جا رہے ہیں اور طلبہ واساتذہ اس سلسلے میں جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔ان کے علاوہ بھی مختلف طبقات کے لوگ حقائق جاننا چاہتے ہیں، پس پردہ عوامل تک رسائی کے خواہش مند ہیں اور نتائج وعواقب کا صحیح طور پر اندازہ کرنا چاہتے ہیں جو ایک فطری بات ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کی صحیح رہنمائی ہماری ذمہ داریوں میں شامل ہے

گوجرانوالہ میں ہم نے ۲۵ جولائی کو لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے الم ناک سانحہ اور مبینہ طور پر ہزاروں افراد کی شہادتوں کے خلاف شہری سطح پر ہڑتال کی کال دی تھی جو بحمد اللہ کامیاب رہی اور ''تحفظ مدارس دینیہ رابطہ کمیٹی'' کی کال پر شہر کی تاجر تنظیموں اور عام شہریوں نے بھرپور ہڑتال کی۔ اس سلسلے میں میرا شہر کی کاروباری تنظیموں کے عہدے داروں کے پاس جانا ہوا تو مختلف سوالات کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ کلاتھ مارکیٹ بورڈ کا باقاعدہ اجلاس تو میرے لیے اور میرے ساتھ جانے والے دیگر علمائے کرام مولانا مشتاق احمد چیمہ، مولانا سید عبدالمالک شاہ، مولانا ایوب صفدر اور بابر رضوان کے لیے باقاعدہ عدالتی کٹہرے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ کلاتھ مارکیٹ بورڈ شہر کی اکثر تاجر تنظیموں کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے سربراہ حاجی نذیر احمد اور ان کے رفقا نے ہڑتال کی کامیابی کے لیے مکمل تعاون کیا بلکہ شکوہ کیا کہ ہم نے ہڑتال کی یہ کال بہت تاخیر سے دی ہے، لیکن بورڈ کے اجلاس میں انھوں نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے بارے میں جس طرح سوالات کیے، اس سے اس مسئلے کے ساتھ ملک کے عام شہریوں کی دلچسپی اور ان کے غم و درد کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۱ جولائی کو جھنگ کے دورے کے آخری روز میں نے علما اور وکلا کی الگ الگ کچہریوں کا سامنا کیا۔ علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد مدرسہ تعلیم القرآن اشرفیہ، مومن پورہ، جھنگ صدر میں جمع تھی جہاں مجھے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے بارے میں دینی جماعتوں اور خاص طور پر وفاق المدارس کے کردار سے متعلق بیسیوں سوالات کے جوابات دینا پڑے، جبکہ اس کے فوراً بعد ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن جھنگ میں وکلا حضرات اسی نوعیت کے سوالات کے ساتھ میرا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ یہ سوالات پورے کے پورے تو اس کالم کے دائرے میں نہیں آ سکتے، البتہ قارئین کی دلچسپی کی خاطر ان میں سے دو تین اہم سوالات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جن میں زیادہ تر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے کردار کے حوالے سے ہیں۔

ایک دوست نے سوال کیا کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے بارے میں زیادہ تر سوالات وفاق المدارس سے متعلق کیوں ہو رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے بارے میں وفاق المدارس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس سلسلے میں اب تک جو کچھ تھوڑا بہت کیا ہے، وہ وفاق نے

ہی کیا ہے۔ باقی کوئی دینی یا سیاسی تنظیم آگے نہیں ہوئی اور اگر کسی نے کچھ کیا بھی ہے تو رسمی طور پر کیا ہے۔ اس طرح معاملات میں دخیل ہو کر معاملات کو نمٹانے کی کوشش وفاق المدارس کے سوا کسی نے نہیں کی جس کی وجہ سے وہ ہر جانب سے طعن واعتراض کا ہدف بن گیا ہے۔ اگر وہ بھی باقی جماعتوں اور تنظیموں کی طرح خاموش تماشائی ہی بنا رہتا اور کوئی عملی کردار ادا نہ کرتا تو دوسری جماعتوں کی طرح وہ بھی طعن واعتراض کا نشانہ بننے سے بچ جاتا۔ ظاہر بات ہے کہ جو عملاً کام کرے گا، وہ کہیں نہ کہیں غلطی بھی کرے گا اور جس نے عملی طور پر کچھ نہیں کرنا، اس کو کون کسی غلطی کا مرتکب قرار دے سکتا ہے؟

ایک صاحب کا سوال تھا کہ وفاق المدارس نے جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا الحاق ختم کر کے انھیں تنہا کیوں کر دیا جس کی وجہ سے معاملات یہاں تک جا پہنچے؟ ان صاحب کا خیال تھا کہ اگر وفاق المدارس ان دونوں مدارس کا الحاق ختم نہ کرتا تو ملک بھر کے تمام مدارس اور ان کے طلبہ کی قوت ان کے ساتھ سمجھی جاتی اور حکومت کو اس انتہائی اقدام کی جرات نہ ہوتی۔ میں نے گزارش کی کہ ایسا کرنا وفاق المدارس کے لیے دو وجہ سے ضروری ہو گیا تھا۔ ایک وجہ یہ کہ نفاذ اسلام اور دیگر دینی مقاصد کے لیے مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید نے جو طریق کار اختیار کیا تھا، مثلاً سرکاری فورسز کے ساتھ مسلح تصادم کی صورت اختیار کرنا، سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرنا، مبینہ قحبہ خانے مساج پارلروں پر چھاپے مار کر لوگوں کو گرفتار کرنا اور متوازی نظام قائم کرنے کی کوشش کرنا وغیرہ، وہ فاق المدارس کے نزدیک درست نہیں تھا۔ وفاق المدارس خود سے الحاق رکھنے والے کسی بھی مدرسے کی اس قسم کی کارروائیوں کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا اور نہ ہی ملک کے دیگر ہزاروں مدارس کو اس ذمہ داری میں شریک کر سکتا ہے، اس لیے اکے پاس اس کے سوا کوئی راستہ ہی باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ یا تو ان اقدامات کی ذمہ داری قبول کرے یا پھر ان مدارس کا الحاق ختم کر کے خود کو اور ملک کے دوسرے ہزاروں مدارس کو ایسے طرز عمل سے بری الذمہ قرار دے۔

جھنگ کے ایک عالم دین نے جو ہمارے پرانے ساتھی ہیں، بہت ناراضی کے لہجے میں مجھ سے پوچھا کہ آپ اس طریق کار کو بار بار غلط کیوں کہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ چونکہ میں غلط سمجھتا ہوں، اس لیے اسے غلط کہنا بھی اپنی ذمہ داری تصور کرتا ہوں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ

جس مسجد میں خطیب ہیں، کیا اسے مورچہ بنا کر آپ جھنگ شہر میں اس قسم کی کارروائیاں کرنے کے لیے تیار ہیں؟ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ نہیں، تو میں نے عرض کیا کہ جس کام کے لیے آپ خود تیار نہیں ہیں، اسے دوسروں کے لیے جائز قرار دینے پر آپ کو کیوں اصرار ہے اور پھر جو کام جھنگ کے لیے آپ درست نہیں سمجھتے، اسے اسلام آباد کے لیے جائز اور ضروری کیوں قرار دے رہے ہیں؟

دوسری وجہ جامعہ فریدیہ اور جامعہ حفصہ کا الحاق ختم کرنے کی یہ ہے کہ وفاق المدارس کی اعلیٰ قیادت اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے خود اسلام آباد پہنچی تھی۔ بڑے بڑے علمائے کرام نے مولانا عبد العزیز اور غازی عبدالرشید کو اس طرز عمل سے روکنے کی مسلسل کوشش کی تھی اور جب سمجھانے بجھانے کے تمام ممکنہ ذریعے اختیار کرنے باوجود کامیابی نہیں ہوئی تو پھر آخری چارۂ کار کے طور پر ان مدارس کے الحاق کو ختم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا جس کی ذمہ داری وفاق کی قیادت پر بہرحال عائد نہیں ہوتی۔

اس ضمن میں ایک سوال یہ سامنے آیا کہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کا الحاق ختم کرنے سے ان دو بڑے مدرسوں کے کم وبیش دس ہزار طلبہ کا تعلیمی مستقبل مخدوش ہو گیا ہے اور ان کا یہ تعلیمی سال ضائع ہو رہا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ وفاق المدارس کی طرف سے واضح اعلان کر دیا گیا ہے کہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے طلبہ اور طالبات وفاق المدارس سے ملحق کسی بھی مدرسے کی طرف سے سالانہ امتحان میں شریک ہو سکتے ہیں، ان کے ساتھ خصوصی رعایت کا معاملہ کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں وزیر اعلیٰ پنجاب کے سابق مشیر حافظ طاہر محمود اشرفی کا بھی ایک تند وتیز بیان آیا ہے جس میں انھوں نے وفاق المدارس کی قیادت پر الزام لگایا ہے کہ وہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے دس ہزار طلبہ اور طالبات کے مستقبل سے کھیل رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر اس طرح کا تند وتیز بیان دے کر حافظ محمود اشرفی اس کے سوا کوئی خدمت سر انجام نہیں دے سکے کہ وفاق المدارس کی قیادت کو مطعون کرنے اور وفاق المدارس کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی حالیہ کوششوں کی اصل سمت کی انھوں نے نشان دہی کر دی ہے کہ ایسی کوششیں کس طرف سے منظم کی جا رہی ہیں۔

وفاق المدارس کے بارے میں ایک بڑا اعتراض یہ بھی کیا جا رہا ہے کہ لال مسجد کا المناک

سانحہ رونما ہو جانے کے بعد اس نے ملک میں تحرک کی کال کیوں نہیں دی؟ میں نے عرض کیا کہ یہ وفاق المدارس کا کام نہیں ہے۔ وفاق المدارس نہ تو کوئی سیاسی جماعت ہے اور نہ ہی تحریکی فورم ہے۔ اس حوالے سے اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ بڑے دینی مدرسوں کے خلاف حکومت کے وحشیانہ آپریشن کی مذمت کرے اور اس سانحہ سے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں واضح موقف اختیار کر کے اس کے لیے قوم کی علمی وفکری رہنمائی کرے اور میرے خیال میں وفاق نے اس سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس نے متعلقہ مسائل پر دوٹوک موقف اختیار کیا ہے اور تمام میسر ذرائع سے وہ اس سلسلے میں علمائے کرام، دینی مدارس اور رائے عامہ کی مسلسل رہنمائی کر رہا ہے۔ عوامی جلسے، جلوس اور احتجاجی تحریک نہ اس کے دائرہ کار میں شامل ہے اور نہ ہی اسے ایسا کرنا چاہیے۔ یہ کام دینی وسیاسی جماعتوں کا ہے اور انھی کا حق ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کر رہیں تو اس کا نزلہ وفاق المدارس پر نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں گوجرانوالہ میں ۱۹۷۶ء کے دوران میں بھٹو حکومت نے مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور کو سیاسی انتقام کے طور پر سرکاری تحویل میں لینے کا نوٹیفکیشن جاری کیا تھا تو اس وقت وفاق المدارس العربیہ کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمود تھے جو قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بھی تھے۔ انھوں نے قومی اسمبلی میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی اور وفاق المدارس کے سربراہ کی حیثیت سے لاہور میں مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کا کنونشن طلب کر کے ہماری تحریک کو سپورٹ کیا تھا، لیکن ہم نے اس سے زیادہ اس تحریک کے لیے وفاق المدارس کو زحمت نہیں دی تھی۔ ہم نے گوجرانوالہ میں مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام اور راہنماؤں پر مشتمل ''عوامی مجلس تحفظ مساجد ومدارس'' تشکیل دے کر احتجاجی تحریک منظم کی تھی۔ نوید انور ایڈووکیٹ مرحوم اس تحریک کے سربراہ تھے۔ ان کی قیادت میں ہم نے کم وبیش چار ماہ تک گوجرانوالہ کی سڑکوں اور بازاروں میں اودھم مچائے رکھا تھا، سینکڑوں افراد گرفتار ہوئے تھے، خود میں بھی ساڑھے تین ماہ تک جیل میں رہا تھا۔ ہمارے ساتھ مولانا عبدالمالک شاہ، ڈاکٹر غلام محمد مرحوم، علامہ محمد احمد لدھیانوی، صوفی رستم علی قادری اور دیگر حضرات شامل تھے جبکہ حضرت مولانا مفتی عبدالواحد، حضرت مولانا محمد سرفراز خان

صفدراور دیگر بزرگ علماے کرام ہماری سرپرستی کر رہے تھے۔

اس تحریک میں بریلوی اوراہل حدیث مکاتب فکر کے علماے کرام بھی ہمارے ساتھ سرگرم تھے، حتیٰ کہ شیعہ رہنما خواجہ عبدالوارث بھی گرفتار ہوئے تھے، مگر ہم نے اس سارے ہنگامے میں وفاق المدارس کی قیادت کو سیاسی واخلاقی سپورٹ اور لاہور کے ایک کنونشن کے سوا زحمت نہیں دی تھی اور ہماری کم وبیش چار پانچ ماہ کی اس تگ ودو کے بعد بھٹو حکومت مدرسہ نصرۃ العلوم اور مسجد نور کو سرکاری تحویل میں لینے کا نوٹیفکیشن واپس لینے پر مجبور ہوگئی تھی۔

اب بھی لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے سانحہ کے بعد گوجرانوالہ کے علماے کرام نے مجھ سے رابطہ کیا اور احتجاجی مظاہروں اور ہڑتال کے سلسلے میں بات کی تو میں نے عرض کیا کہ میں اس سلسلے میں کسی تحریک کے لیے وفاق المدارس کا فورم استعمال کرنے کے حق میں نہیں ہوں، چنانچہ ہم نے ''تحفظ مدارس دینیہ رابطہ کمیٹی'' قائم کر کے اس میں تمام مکاتب فکر کے علماے کرام اور تاجر تنظیموں کو شامل کیا اور ۲۵ جولائی کی ہڑتال اور پرجوش عوامی مظاہرے کو منظم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس لیے کسی عوامی تحریک اور احتجاجی مہم کے بارے میں میرا دوٹوک موقف یہ ہے کہ اس کے لیے وفاق المدارس کا فورم کسی صورت میں استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دینی وسیاسی جماعتوں کا کام ہے اور انھی کو کرنا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ وہ کسی وجہ سے ایسا نہیں کر پا رہیں تو اس کے لیے تحفظ مدارس دینیہ کے عنوان سے کوئی الگ مشترکہ پلیٹ فارم تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ سوال کا تذکرہ بھی شاید نامناسب نہ ہو۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ جب سے آپ وفاق المدارس العربیہ کی مجلس عاملہ کے رکن بنے ہیں، بے عمل اور غیر فعال ہو گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں، میں وفاق المدارس العربیہ کے حوالے سے بے عمل اور غیر فعال نہیں ہوا، بلکہ ۱۹۹۰ء میں جب میں نے جمعیۃ علماے اسلام کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے منصب سے استعفا دیا تھا، اسی وقت میں نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ زندگی بھر جمعیت کا رکن رہوں گا، مگر عملی سیاست میں غیر متحرک اور غیر فعال رہوں گا، البتہ علمی، فکری اور نظریاتی محاذ پر اپنی استطاعت کے مطابق مسلسل کام کرتا رہوں گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک عملی سیاست

سے کہیں زیادہ فکری اور نظریاتی محنت کی ضرورت ہے اور میں خود کو اس کے لیے زیادہ موزوں سمجھتا ہوں، اس لیے میری بے عملی کو وفاق المدارس سے منسوب نہ کیا جائے اور دعا کی جائے کہ میں اپنے اس پروگرام پر آخری دم تک عمل جاری رکھ سکوں۔ (آمین)

سانحہ لال مسجد اور وفاق المدارس کا اجلاس

دو روز سے ملتان میں ہوں اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے ہنگامہ خیز اجلاس میں شریک رہا ہوں۔ یہ اجلاس لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے الم ناک سانحہ کے بارے میں خصوصی طور پر طلب کیا گیا تھا اور اس کے بارے میں کئی دنوں سے خبریں آ رہی تھیں کہ اس میں خاصی گہما گہمی ہوگی، اس لیے کہ سانحہ لال مسجد کے حوالے سے وفاق المدارس کی جدوجہد کے بارے میں بہت سے احباب شکوک وشبہات کا شکار ہیں اور تحفظات رکھتے ہیں جبکہ بعض حلقوں کی طرف سے شکوک وشبہات کا ماحول پیدا کرنے کی باقاعدہ کوشش بھی کی جا رہی ہے، اس لیے اجلاس شروع ہونے سے پہلے ہی اس قسم کی گہما گہمی کی توقع کی جا رہی تھی اور یہ گہما گہمی ہوئی بھی مگر 'رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت' والا معاملہ ہوا اور بحمد اللہ تعالیٰ اجلاس کم وبیش ساڑھے پانچ گھنٹے جاری رہنے کے بعد حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم کے اختتامی خطاب اور دعا پر اختتام پذیر ہوا۔

وفاق المدارس کے بارے میں دوستوں کے گلے شکوے دو قسم کے ہیں۔ ایک طرف وہ دوست ہیں جن کا کہنا ہے کہ وفاق المدارس لال مسجد کے سانحہ کے بارے میں کوئی کردار کیوں ادا کر رہا ہے؟ ان کے خیال میں وفاق ایسا کر کے اپنی حدود سے تجاوز کر رہا ہے اور خواہ مخواہ سیاست میں گھس رہا ہے، چنانچہ ہمارے مخدوم زادہ محترم مولانا میاں محمد اجمل قادری صاحب کا ایک بیان اجلاس والے روز ہی یعنی ۷/ اگست کو ملتان کے اخبارات میں شائع ہوا کہ وفاق المدارس نے لال مسجد کے سانحہ کے بارے میں سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر کے اپنی حدود کار سے تجاوز کیا ہے اور خواہ

مخواہ سیاست میں گھسنے کی کوشش کی ہے، اس لیے اسے یہ رٹ واپس لے لینی چاہیے کیونکہ لال مسجد کے بارے میں ایسا کرنا صرف مولانا عبدالعزیز کا حق ہے، لیکن اس کے علی الرغم بعض دوسرے احباب کا خیال ہے، جس کا اظہار انھوں نے پورے جوش وخروش کے ساتھ اجلاس میں بھی کیا کہ وفاق کو یہ رٹ بہت پہلے دائر کرنی چاہیے تھی اور جس وقت لال مسجد کے خلاف آپریشن شروع ہوا تھا، اس وقت سپریم کورٹ سے رجوع کر کے اس آپریشن کو رکوانا چاہیے تھا۔ ان کے خیال میں وفاق کا یہ اقدام بعد از وقت ہے اور اس نے یہ قدم اپنی ساکھ بچانے کے لیے کیا ہے، مگر یہ دوست وفاق پر اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے یہ بات بھول گئے کہ سپریم کورٹ نے لال مسجد کے خلاف آپریشن کے دوران ہی اس کا ازخود نوٹس لیا تھا، لیکن جب عدالت عظمیٰ سے درخواست کی گئی تھی کہ آپریشن کے خلاف حکم امتناعی جاری کر کے اسے رکوایا جائے تو اس نے یہ کہہ کر اس سے انکار کر دیا تھا کہ یہ اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے۔

وفاق کی مجلس شوریٰ کے اجلاس کے دوران میں بھی اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے دوستوں نے دونوں طرح کی باتیں کیں۔ ایک دوست نے وفاق کے دستور کی ایک دفعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ دستور میں لکھا ہے کہ وفاق المدارس کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے گا، اس لیے وفاق کو اپنی سرگرمیاں تعلیمی اور امتحانی حدود تک محدود رکھنی چاہییں، مگر دوسری طرف بہت سے دوستوں کا اصرار تھا کہ وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کو حکومت کے خلاف باقاعدہ تحریک کا اعلان کرنا چاہیے بلکہ بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ صدر پرویز مشرف کو ''واجب العزل'' قرار دینے کا فتویٰ جاری کر کے اس کے لیے تحریک منظم کرنی چاہیے، چنانچہ جمعیۃ علماے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن نے اس صورت حال پر اجلاس کے دوران میں اپنے خطاب میں یہ تبصرہ کیا کہ وفاق المدارس عجیب مخمصے کی حالت میں ہے۔ اگر وہ کچھ کرتا ہے تو دوست معترض ہوتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے اور اگر وہ اپنی حدود کار سے آگے بڑھنے سے ہچکچاتا ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں کرتا تو بھی بہت سے احباب کو اعتراض ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں نہیں کر رہا؟

بہر حال اس فضا میں وفاق المدارس کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقد ہوئے۔

مجلس عاملہ کا اجلاس ۶ /اگست کی شام کو ہوا اور مجلس شوریٰ کا اجلاس ۷/اگست کو صبح دس بجے کے لگ بھگ شروع ہو کر تقریباً ساڑھے تین بجے تک جاری رہا۔ اس کے درمیان صرف نماز ظہر کا وقفہ ہوا اور شرکا نے کھانا اجلاس سے فراغت کے بعد کھایا۔

مجلس عاملہ کے اجلاس میں زیادہ تر بحث مولانا عبد الغفار کی اس باضابطہ درخواست کے حوالے سے ہوئی کہ جامعہ فریدیہ کا وفاق المدارس کے ساتھ الحاق بحال کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی زیر بحث رہی کہ جامعہ فریدیہ کے طلبہ اور جامعہ حفصہ کی طالبات کا تعلیمی سال بچانے کے لیے ۱۱/اگست کو شروع ہونے والے وفاق کے سالانہ امتحانات میں ان کی زیادہ سے زیادہ شرکت کو کس طرح یقینی بنایا جائے۔

مولانا عبد الغفار جامعہ فریدیہ کے پرانے اساتذہ میں سے ہیں جن کے بارے میں وفاق المدارس نے یہ تجویز کیا تھا کہ جامعہ فریدیہ کا نظام اگر حکومت مولانا عبد الرشید غازی شہید کی خواہش کے مطابق وفاق المدارس کے سپرد نہیں کرتی تو مولانا عبد الغفار کی سربراہی میں جامعہ فریدیہ کے پرانے اساتذہ کی کمیٹی قائم کر کے جامعہ فریدیہ کا نظم اس کے سپرد کر دیا جائے، جبکہ مولانا عبد العزیز نے بھی جامعہ فریدیہ کے نظم ونسق کی نگرانی کے لیے انھی کو اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے اور مولانا عبد الغفار نے وفاق کو الحاق کی بحالی کے لیے باقاعدہ درخواست ارسال کی ہے۔

امتحانات میں جامعہ حفصہ کی طالبات اور جامعہ فریدیہ کے طلبہ کی شرکت کے بارے میں اجلاس میں بتایا گیا کہ وفاق کی مجلس عاملہ نے اپنے ۱۸/اپریل ۲۰۰۷ کے اجلاس میں ہی یہ اعلان کر دیا تھا جو وفاق کے ماہنامہ میں شائع ہو چکا ہے کہ وہ وفاق سے الحاق رکھنے والے کسی بھی مدرسہ کی طرف سے داخلہ کے لیے فارم بھجوا سکتے ہیں، انھیں امتحان میں شریک کیا جائے گا۔ اس موقع پر دفتر وفاق کی طرف سے بتایا گیا کہ لال مسجد کے آپریشن سے قبل بھی جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے سینکڑوں طلبہ اور طالبات کی طرف سے امتحان میں داخلہ کے فارم مختلف مدارس کی طرف سے بھجوائے گئے ہیں جو منظور کیے گئے ہیں اور ریکارڈ پر ہیں، جبکہ لال مسجد کے سانحہ کے بعد بھجوائے جانے والے اس نوعیت کے داخلہ فارموں کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ہے اور جامعہ حفصہ اور

جامعہ فریدیہ کے طلبہ اور طالبات کے لیے یہ گنجایش رکھی گئی ہے کہ وہ امتحان شروع ہونے کے دن یعنی ۱۱؍اگست کی صبح کو بھی داخلہ فارم پیش کریں گے تو انھیں امتحان میں شریک کیا جائے گا اور ان کا داخلہ فارم آخر وقت تک سنگل فیس کے ساتھ وصول کیا جائے گا۔

اس پر مجلس عاملہ نے مولانا عبد الغفار کی درخواست کے بعد یہ اضافہ کیا کہ دیگر مدارس کی طرف سے بھجوائے جانے والے داخلہ فارموں کے علاوہ جامعہ حفصہ کی طالبات اور جامعہ فریدیہ کے طلبہ اگر مولانا عبد الغفار کی تصدیق کے ساتھ داخلہ فارم بھجوائیں گے تو اسے بھی منظور کیا جائے گا اور انھیں امتحان میں شریک کر لیا جائے گا، البتہ جامعہ فریدیہ کے وفاق المدارس کے ساتھ الحاق کی بحالی کا معاملہ چونکہ کچھ ضروری تفصیلات کا متقاضی ہے، اس لیے اس سلسلے میں وفاق المدارس کے نائب صدر حضرت مولانا حسن جان مدظلہ کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے جس میں مولانا عبد الغفار کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں جامعہ فریدیہ اور اس کی شاخوں کے بارے میں وفاق کی آئندہ پالیسی طے کی جائے گی۔

وفاق المدارس کی طرف سے لال مسجد آپریشن کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیے جانے کے بارے میں اجلاس کو بتایا گیا کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اس سلسلے میں وفاق کی جانب سے ممتاز قانون دانوں کے مشورہ سے تیاری کرائی ہے اور وفاق اس رٹ کی پیروی میں پوری طرح سنجیدہ ہے، چنانچہ اس کے لیے باضابطہ کمیٹی بنائی گئی ہے جو اس رٹ کی پیروی کرے گی اور یہ طے پایا کہ ۹؍اگست کو سپریم کورٹ میں اس رٹ کی ابتدائی پیشی کے موقع پر حضرت مولانا سلیم اللہ خان اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی سمیت وفاق کی اعلیٰ قیادت اور اسلام آباد اور راول پنڈی کے سرکردہ علمائے کرام عدالت عظمیٰ میں موجود ہوں گے۔

مجلس شوریٰ کا اجلاس ۷؍اگست کو صبح دس بجے کے قریب شروع ہوا۔ اجلاس کا آغاز حضرت مولانا حسن جان صاحب کی صدارت میں ہوا جبکہ تھوڑی دیر کے بعد صدر وفاق حضرت مولانا سلیم اللہ خان بھی تشریف لے آئے اور مسند صدارت سنبھال لی۔ اجلاس میں وفاق کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے سانحہ لال مسجد کے بارے میں آغاز سے اب تک کی صورت

حال کے بارے میں تفصیلی رپورٹ پیش کی اور اس سلسلے میں کیے جانے والے بہت سے سوالات واعتراضات کی وضاحت کی۔ اس کے بعد عمومی بحث کا آغاز ہوا جس میں ایک درجن کے لگ بھگ احباب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں جذبات کی شدت بھی تھی جو سانحہ لال مسجد کی سنگینی کے پس منظر میں فطری بات تھی اور یہ دوستوں کا حق بھی تھا۔ ان تقاریر میں شکوک واعتراضات کی بھرمار بھی تھی، بہت سے تحفظات کا اظہار بھی تھا اور وفاق کی قیادت سے مستعفی ہونے کے مطالبات بھی تھے، لیکن جب جمعیۃ علماے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن نے، جو اس اجلاس میں جامعہ معارف شرعیہ ڈیرہ اسماعیل خان کے مہتمم کی حیثیت سے رکن شوریٰ کے طور پر شریک تھے، اپنے تفصیلی خطاب میں موجودہ عالمی اور ملکی صورت حال کا جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ اس خطے میں عالمی استعماری قوتیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کس انداز سے آگے بڑھ رہی ہیں تو مجلس شوریٰ کے اجلاس کا ماحول خاصا تبدیل ہو گیا اور ان کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے اپنے خطاب میں مولانا فضل الرحمٰن کی تائید کرتے ہوئے کچھ مزید امور کا اضافہ کیا تو اجلاس میں جوش اور ہوش کا توازن بحال ہوا اور پھر ان دونوں بزرگوں کی تجویز پر ہاؤس نے ہاتھ اٹھا کر غالب اکثریت کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کیا کہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان سب کو منضبط کیا جائے اور انھیں منظّم ومرتب صورت میں وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ وہ ان کی روشنی میں لال مسجد کے سانحہ کے بارے میں وفاق المدارس کی آئندہ جدوجہد کا تفصیلی لائحہ عمل طے کر سکے، چنانچہ اس مقصد کے لیے مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۸؍اگست کو کراچی میں طلب کر لیا گیا ہے۔

اس موقع پر حضرت مولانا سلیم اللہ خان نے بعض شرکا کے مطالبہ کی وجہ سے اپنی طرف سے اور مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی طرف سے وفاق کے صدر اور سیکرٹری جنرل کے عہدوں سے مستعفی ہونے کی پیش کش کی مگر مانسہرہ کے مولانا مفتی کفایت اللہ کی تحریک پر شرکاے اجلاس نے ہاتھ اٹھا کر مجلس عاملہ پر اعتماد کا اظہار کیا جس سے یہ بات ختم ہو گئی۔

وفاق کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مولانا فضل الرحمٰن کا تفصیلی خطاب میرے نزدیک موجودہ

عالمی اور ملکی صورت حال میں دینی حلقوں کے کردار کے حوالے سے ایک بہترین اور راہ نما تجزیہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے مکمل طور پر شائع کیا جانا چاہیے، مگر اس کالم میں ان کے خطاب کے صرف دو حصوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

o حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی جیسی شخصیات ہمارے لیے راہ نما اور سایہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور دیوبندی مسلک کی علمی قیادت کی صف اول ہیں۔ اگر ہم ان کی بات بھی نہیں مانیں گے اور ان پر بھی اعتماد نہیں کریں گے تو پھر اور کون ہے جسے ہم اپنے راہ نما کی حیثیت دیں گے اور ان پر اعتماد کر کے ان کی بات مانیں گے؟

o وفاق المدارس العربیہ وہ واحد فورم ہے جو دیوبندی مسلک کی تمام جماعتوں اور حلقوں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ ہم وقتاً فوقتاً اس گھر میں سب اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ایک چھت کے نیچے مل جل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسے سبوتاژ کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔ ہمیں ایسی کوششوں سے خبردار رہنا چاہیے اور اس وحدت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اس وقت ہماری مسلکی وحدت کا یہی ایک نشان باقی رہ گیا ہے۔

خدا کرے کہ ہم مولانا فضل الرحمٰن کی ان دو فکر انگیز باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دے سکیں۔ آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام،)

وفاق کے اجلاس کے حوالے سے چند توضیحات

بات اگر ''پاکستان'' کے ادارتی نوٹ کی نہ ہوتی تو لال مسجد اور وفاق المدارس کے مسئلے پر مزید کچھ لکھنے کا ارادہ نہ تھا، کیونکہ اس کے بارے میں جو کچھ لکھ چکا ہوں، بعض تند و تلخ جوابات کے باوجود اس میں کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میں مناظرانہ اسلوب اور طعن و تشنیع کی زبان کا عادی نہیں ہوں اور اپنی بات وضاحت کے ساتھ بیان کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا کرتا ہوں کہ وہ دونوں طرف کی بات پڑھ لیں اور پھر اس کے مطابق جو رائے وہ قائم کر سکیں، کر لیں۔ مگر ''پاکستان'' کے ادارتی نوٹ کے باعث مجھے اس مسئلے پر مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اس لیے کہ ''پاکستان'' کے مدیر محترم نے اس نوٹ میں علمائے کرام کو کوسنے اور ان سے معافی مانگنے کے مطالبہ کا جو انداز اختیار کیا ہے، اس کی بنیاد مفروضات پر ہے اور کسی بھی ذمہ دار صحافی سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ خدا جان کون سے ''ثقہ راوی'' کی رپورٹ سے مدیر محترم نے اس طعن و تشنیع اور تلقین و توبیخ کا تانا بانا بنا ہے اور انھوں نے فرمایا ہے کہ:

''وفاق المدارس العربیہ کے اجلاس میں، جو منگل کے روز ملتان میں منعقد ہوا، لال مسجد کے معاملے پر علما کے درمیان تلخ کلامی اور پھر ہاتھا پائی ہوئی۔ تلخی کا آغاز مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق کے درمیان تو تکار اور تلخ کلامی سے ہوا۔ علما نے ایک دوسرے پر دوہرے معیار اور ''دوغلے پن'' کا مظاہرہ کرنے کے الزامات عائد کیے۔ اس دوران بعض شرکا کے درمیان ہاتھا پائی بھی ہوئی۔''

اس پر ''پاکستان'' کے اداریہ نویس بزرگ نے جو تبصرہ کیا ہے، میں اس کے بارے میں کچھ

عرض نہیں کروں گا اور نہ ہی اس کے لب ولہجہ اور ادارتی معیار کی طرف توجہ دلاؤں گا، اس لیے کہ کوئی رائے قائم کر کے اس کا اظہار کرنا اور اس کے لیے اپنے حسب حال لب ولہجہ اور اسلوب اختیار کرنا ان کا حق ہے، البتہ مذکورہ بالا جس رپورٹ پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس کے بارے میں ضرور گزارش کرنا چاہوں گا کہ یہ خلاف واقعہ اور انتہائی مبالغہ آمیز ہے اور اگر مدیر محترم صرف اپنے ''ثقہ راوی'' پر انحصار کرنے کے بجائے اجلاس کے شرکا سے بھی دریافت کر لیتے تو انھیں اس قدر تلخ نوائی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس شوریٰ کے مذکورہ اجلاس میں اول سے آخر تک شریک رہا ہوں اور دس بجے کے لگ بھگ شروع ہو کر تقریباً ساڑھے تین بجے تک جاری رہنے والے اس اجلاس کی ساری کارروائی خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اس میں مولانا سمیع الحق کو تشریف لاتے بھی دیکھا ہے، تشریف لے جاتے بھی دیکھا ہے اور ان کو مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے ساتھ کافی دیر تک بیٹھے بھی دیکھا ہے۔ میں ان دونوں کے ایک جانب صرف چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھا تھا۔ بخدا میں نے ان کے مابین تو تکار یا تلخ کلامی کا کوئی منظر نہیں دیکھا اور نہ ہی ان کے درمیان ہونے والی کسی گفتگو کی آواز سنی ہے۔ خدا جانے یہ کون سی تو تکار یا تلخ کلامی تھی کہ چار پانچ فٹ کے فاصلے پر میں اسے نہیں سن سکا اور اجلاس سے باہر کے لوگوں نے اس کی تفصیلات بھی سن لیں اور بعض اخباری رپورٹوں میں اس پر ''بائیکاٹ'' کا عنوان بھی قائم کر لیا۔

بات صرف اتنی ہوئی کہ اجلاس جب شروع ہوا تو تلاوت کلام پاک کے بعد وفاق کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے حوالے سے اب تک کی صورت حال اور وفاق المدارس کی کارکردگی کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس دوران میں مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق بھی تشریف لے آئے۔ قاری محمد حنیف جالندھری کی تقریر کچھ طویل ہونے لگی تو شرکا میں سے بعض حضرات نے تقریر کی طوالت پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہمیں بھی کچھ کہنے کا موقع دیا جائے۔ اس پر قاری صاحب نے اپنی تقریر ختم کر دی اور ارکان شوریٰ سے کہا گیا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں جس کے بعد مختلف دوستوں نے باری باری گفتگو کی جن کی تعداد ایک درجن

سے کم نہیں ہوگی۔ ان دوستوں کی گفتگو میں جذبات کا اظہار بھی تھا، اعتراضات وشکوک بھی تھے، گلے شکوے بھی تھے اور تندی اور تلخی بھی تھی جو ظاہر ہے کہ لال مسجد کے سانحہ کی سنگینی اور شدت کے باعث ایک فطری بات تھی۔ اس دوران میں قاری محمد حنیف جالندھری صاحب نے مولانا سمیع الحق سے عرض کیا کہ آپ بھی کچھ کہہ دیں تو انھوں نے فوری طور پر آمادی کا اظہار نہیں کیا جس کے بعد مولانا فضل الرحمٰن نے اپنی گفتگو شروع کی جو خاصی فکر انگیز اور طویل تھی۔ ان کی تقریر ابھی جاری تھی کہ مولانا سمیع الحق صاحب خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے جسے اخبارات نے ''بائیکاٹ'' سے تعبیر کر دیا، لیکن اسے بائیکاٹ کا عنوان دینے والوں نے یہ نہ سوچا کہ اگر مولانا سمیع الحق نے بائیکاٹ ہی کرنا تھا تو وہ اس میں تنہا نہ ہوتے، اس لیے کہ ان کے تشریف لے جانے کے بعد ان کے بھائی مولانا انوار الحق حقانی آخر وقت تک اجلاس میں شریک رہے اور مولانا سمیع الحق کی جمعیۃ علماے اسلام کے صوبائی امیر مولانا بشیر احمد شاد نہ صرف یہ کہ اجلاس میں مسلسل شریک رہے بلکہ انھوں نے اجلاس سے خطاب بھی کیا۔ اسے اگر ''پاکستان'' کے مدیر محترم تو تکار اور تلخ کلامی سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض اخبار نویس اس پر ''بائیکاٹ'' کا عنوان قائم کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو یہ ان کی مرضی کی بات ہے، ورنہ اصل واقعہ میں نے عرض کر دیا ہے۔

''ہاتھا پائی'' کی بات بھی سن لیں۔ اجلاس کے دوران میں مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ آئے ہوئے فاٹا کے ایک سینٹر صاحب نے بھی گفتگو کی اور لال مسجد کے سانحہ کے والے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ظاہر بات ہے کہ جب وہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بات کر رہے تھے تو ان کا حق تھا کہ وہ جو محسوس کرتے ہیں، اس کا دیانت داری کے ساتھ اظہار کریں، لیکن ان کی گفتگو کے ایک جملے پر شور مچ گیا اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے الفاظ واپس لیں۔ اس دوران ایک صاحب انتہائی غصے کے عالم میں ان کا گریبان پکڑنے کے لیے آگے بڑھے تو دوسرے حضرات نے درمیان میں آ کر انھیں روک دیا اور سینیٹر صاحب نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ انھوں نے جو کہا تھا، اس پر مجھے بھی اعتراض تھا لیکن میں اسے شورائی مزاج کے خلاف سمجھتا ہوں کہ مجلس شوریٰ میں کسی مسئلے پر بحث کے دوران میں کسی شخص کو اپنی رائے اور احساسات کے اظہار سے روکا جائے۔ بہر حال جو کچھ ہوا،

اتنا ہی ہوا جسے ''پاکستان'' کے مدیر محترم نے علمائے کرام کے درمیان ''ہاتھا پائی'' قرار دیا ہے اور اس پر ملک بھر کے علمائے کرام کو جھاڑ بھی پلا دی ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ عرض کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ لال مسجد کے سانحہ کے حوالے سے وفاق المدارس کی قیادت کے کردار پر دوستوں کے تحفظات تھے اور اشکالات تھے جن کا اظہار ان کا حق تھا اور سانحہ کی سنگینی کے باعث ان میں شدت کا پیدا ہو جانا فطری بات تھی، مگر امر واقعہ یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں ہوا جس کا اخبارات میں دو تین روز تک ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا اور جسے بنیاد بنا کر مدیر محترم نے ''پاکستان'' کا مذکورہ ادارتی نوٹ تحریر فرمایا ہے۔

وفاق کی کارکردگی کے بارے میں خود وفاق میں شامل دوستوں کی شکایات اور تحفظات دو طرفہ ہیں۔ بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ وفاق المدارس ایک تعلیمی اور امتحانی بورڈ ہے جسے اپنی سرگرمیاں صرف اس دائرے میں محدود رکھنی چاہییں اور اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ ایک دوست نے مجلس شوریٰ کے اجلاس میں وفاق المدارس کے دستور کی ایک شق کا حوالہ دیا کہ ''وفاق المدارس کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لے گا۔'' ان کا کہنا ہے کہ وفاق کو تحریکی یا سیاسی کردار ادا نہیں کرنا چاہیے اور انھیں اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ وفاق المدارس نے سپریم کورٹ میں لال مسجد کے خلاف آپریشن کے قانونی جواز کو چیلنج کیوں کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ اقدام وفاق کی حدود کار سے تجاوز ہے، جبکہ دوسری طرف بعض دوستوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وفاق کو باقاعدہ حکومت کے خلاف تحریک کی کال دے کر ملک بھر کے طلبہ اور عوام کو سڑکوں پر لانا چاہیے بلکہ حکومت کے خلاف اعلان جہاد کرنا چاہیے۔ وفاق المدارس کی قیادت ان دو انتہاؤں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ وفاق کو تحریکی اور سیاسی کردار سے الگ رکھنے کے خواہش مند دوست بھی وفاق کا حصہ ہیں اور وفاق المدارس سے تحریک اور جہاد کے اعلان کا مطالبہ کرنے والے حضرات بھی وفاق کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ وفاق المدارس ان دونوں میں سے کسی بازو سے محروم نہیں ہونا چاہتا اور دونوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے، اسی لیے اس نے اعتدال اور توازن کا دامن تھاما ہوا ہے۔

گزشتہ روز علمائے کرام کی ایک مجلس میں مجھ سے سوال ہوا کہ آپ کا ذاتی نقطہ نظر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں درمیان والوں میں سے ہوں۔ میرے نزدیک یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ وفاق المدارس خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتا رہا اور دوسری دینی جماعتوں کی طرح خود کچھ نہ کرتے ہوئے محض دوسروں پر طعن واعتراض کو اپنا وطیرہ بنائے رکھے اور یہ بات بھی قطعی طور پر درست نہیں ہوگی کہ وفاق بغیر سوچے سمجھے تحریک کی کال دے اور ملک بھر کے اساتذہ اور طلبہ کو سڑکوں پر لا کر کسی عوامی تحریک کا پرچم اٹھا لے۔

وفاق المدارس کا اصل کردار تعلیمی اور امتحانی امور تک ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی تشخص اور آزادانہ کردار کا تحفظ بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور وفاق نے اس کے لیے خاصی جدوجہد کی ہے، اس لیے جہاں مدارس کے خلاف عالمی استعمار کی یلغار اور مدارس کے تعلیمی اور دینی کردار کو محدود کرنے کے لیے حکومتی اقدامات کا مسئلہ ہوگا یا کسی دینی مدرسہ کے خلاف کسی نوعیت کے ایکشن کی بات ہوگی، وہاں وفاق المدارس کے اپنے دستور کے دائرے میں رہتے ہوئے بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا، لیکن کسی مسئلہ پر عوامی تحریک کو منظم کرنا، لوگوں کو سڑکوں پر لانا اور کسی حکومت کے خلاف سیاسی انداز کی جدوجہد کرنا بہرحال وفاق المدارس کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے دینی وسیاسی جماعتیں موجود ہیں، یہ انھی کا کام ہے۔ آخر جمعیۃ علمائے اسلام، کالعدم سپاہ صحابہ، مجلس تحفظ ختم نبوت اور دوسری بہت سی دینی جماعتیں کس مرض کا علاج ہیں کہ ان کی موجودگی میں وفاق المدارس کو تحریکی کردار ادا نہ کرنے پر مسلسل کوسا جا رہا ہے؟

(۱۱/اگست، ۲۰۰۷)

سپریم کورٹ میں وفاق المدارس کی آئینی درخواست

میں اس وقت جدہ میں ہوں۔ پرسوں ۱۳/اگست کو عشا کی نماز کے وقت یہاں پہنچا ہوں۔ یوم آزادی یہیں گزارا ہے اور آج ۱۵/اگست کو مدینہ منورہ روانہ ہونے سے قبل یہ سطور تحریر کر رہا ہوں۔ مولانا عبدالعزیز کے بھانجے عامر صدیق اور ہمشیرگان محترمات کی پریس کانفرنس کی رپورٹ میں نے سفر کے دوران پڑھی ہے جس میں انھوں نے مولانا عبدالعزیز کی طرف سے اپنے وکیل کی تبدیلی اور وفاق المدارس العربیہ کی جدوجہد پر اطمینان کے اظہار کا اعلان کیا ہے اور یہ تجربہ بیان کیا ہے کہ ان کے بعض نمائندے ان کے اور علماے کرام کے درمیان اختلافات اور غلط فہمیوں کا باعث بنے ہیں۔

میرے نزدیک یہ دونوں باتیں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے حوالے سے دینی جدوجہد کے مستقبل کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ مولانا عبدالعزیز نے شوکت عزیز صدیقی صاحب کو اپنے خاندان کی طرف سے وکیل مقرر کیا ہے جو لال مسجد آپریشن کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر کی جانے والی رٹ میں وفاق المدارس کے بھی وکیل ہیں اور اس طرح وفاق المدارس کی عدالتی جدوجہد اور مولانا عبدالعزیز کی قانونی تگ ودو میں عملی ہم آہنگی کا امکان واضح ہوتا دکھائی دینے لگا ہے جو نہ صرف یہ کہ خوش آئند ہے بلکہ عدالتی جدوجہد کے منظّم اور مربوط طور پر آگے بڑھنے کے لیے ضروری بھی ہے۔ اسی طرح مولانا عبدالعزیز اور ان کے اہل خاندان کو اس امر کا احساس ہو جانا بھی اطمینان بخش ہے کہ اس سارے عمل کے دوران میں کچھ لوگ مولانا عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے ساتھ ملک کی اعلیٰ دینی قیادت، بالخصوص وفاق المدارس کے راہ نماؤں کے مثبت روابط میں رکاوٹ بنتے رہے ہیں۔

مجھے کسی خاص شخصیت سے غرض نہیں، اسی لیے میں کسی کا نام نہیں لے رہا، لیکن اپنے کم وبیش چالیس سالہ تجربہ کی بنیاد پر لال مسجد کا تنازع شروع ہونے کے دن سے ہی مجھے یہ شدت کے ساتھ محسوس ہوتا رہا ہے کہ کچھ لوگ درمیان میں ضرور موجود ہیں جو اس مقصد کے لیے متحرک ہیں کہ وفاق المدارس کی قیادت، ملک کی دینی جماعتوں اور خاص طور پر اسلام آباد اور راول پنڈی کے سرکردہ علمائے کرام سے مولانا عبدالعزیز، غازی عبدالرشید شہید اور ان کے اہل خاندان کو دور رکھا جائے اور غلط فہمیوں اور بے اعتمادی کی ایسی فضا قائم کر دی جائے کہ ملک کی عمومی دینی قوت نہ تو اس خاندان کے کام آ سکے اور نہ ہی ان کی جدوجہد کو کوئی ایسا رخ دے سکے جو اس دینی محنت کے مثبت طور پر آگے بڑھنے کا ذریعہ بن جائے۔ ایسے افراد دونوں طرف موجود ہو سکتے ہیں، اس لیے اگر اس پہلو سے پوری صورت حال کا از سرِنو جائزہ لے لیا جائے تو میرے خیال میں مطلع مزید صاف ہو سکتا ہے اور باہمی اعتماد کی فضا میں مستقبل کے تحریکی امکانات کو بہتر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

وفاق المدارس نے اپنی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں پیش کی جانے والی معزز ارکان کی شکایات، اعتراضات، تجاویز اور مطالبات کا جائزہ لینے کے لیے ۱۸؍ اگست کو کراچی میں مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر رکھا ہے جو ظاہر ہے کہ خاصی اہمیت کا حامل ہوگا، لیکن میں ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکوں گا، اس لیے اس اجلاس کے ممکنہ ایجنڈے کے بارے میں کچھ ضروری گزارشات اس کالم کے ذریعے پیش کر رہا ہوں۔ البتہ اس سے قبل اس رٹ درخواست کا اردو ترجمہ قارئین کی معلومات کے لیے درج کر رہا ہوں جو لال مسجد کے آپریشن کے خلاف وفاق المدارس کے صدر حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور سیکرٹری جنرل مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی طرف سے عدالت عظمیٰ میں دائر کی گئی ہے اور اسے سماعت کے لیے منظور کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ ان سطور کی اشاعت تک غالباً سامنے آ چکا ہوگا۔

وفاق المدارس کے صدر محترم اور سیکرٹری جنرل کی جانب سے عدالت عظمیٰ میں پیش کی جانے والی درخواست کا اردو ترجمہ یہ ہے:

’’بخدمت جناب محترم چیف جسٹس، پاکستان سپریم کورٹ، اسلام آباد

جناب عالی!

- درخواست دہندہ وفاق المدارس کے صدر اور جنرل سیکرٹری ہیں، جو پاکستان کے دینی مدارس کا ایک وفاق ہے جو دینی مدارس کے نصاب اور ملک بھر میں منعقد کیے جانے والے امتحانات سے متعلق امور کی نگرانی کرتا اور انھیں کنٹرول کرتا ہے اور تقریباً دس ہزار دینی مدارس وفاق المدارس کے ساتھ الحاق رکھتے ہیں۔

- لال مسجد/جامعہ حفصہ میں انتہائی غیر انسانی، افسوس ناک، ظالمانہ اور دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا ہے۔ انتظامیہ کے اس غیر قانونی ایکشن کے نتیجے میں، جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، سینکڑوں انسانی جانوں کو، جن میں لڑکے، لڑکیاں اور بزرگ شامل ہیں، بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ ہر شہری کا بنیادی حق ہے کہ اس کے ساتھ قانون کے مطابق معاملہ کیا جائے اور کسی بھی حال میں قانون سے ہٹ کر اسے اس کی زندگی یا آزادی سے محروم نہ کیا جائے۔

- پاکستان کے قوانین یہ قرار دیتے ہیں کہ جو شخص بھی کسی کے قتل کا ذمہ دار ہو، اس کے ساتھ ملک کے قانون کے مطابق معاملہ کیا جائے، چنانچہ مسٹر جسٹس محمد نواز عباسی کی طرف سے چیف جسٹس آف پاکستان کے نام لکھے گئے نوٹ اور اس کے نتیجے میں (عدالت کے) سوموٹو ایکشن نمبر ۹، ۲۰۰۷ میں کہا گیا ہے کہ:

> ''معصوم شہریوں کا قتل، خواہ ان دہشت گردوں کے ہاتھوں ہو یا قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کے ہاتھ سے، صریح طور پر ''قتل عمد'' کے دائرے میں آتا ہے اور اس طرح کے قتل کی انفرادی ذمہ داری کے علاوہ ان تمام لوگوں کو بھی، جو اس واقعے کے ذمہ دار ہیں، قانونی نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔''

- انتظامیہ کے کہنے پر (جامعہ حفصہ) کے طلبہ نے اپنے آپ کو انتظامیہ کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جو شخص سرنڈر کر دے گا، اس کے خلاف کوئی فوج داری مقدمہ قائم نہیں کیا جائے گا، لیکن انتظامیہ اپنے اس وعدے سے منحرف ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں چالیس سے زیادہ طلبہ ابھی تک سلاخوں کے پیچھے ہیں۔ انتظامیہ یہ بات بھی چھپا رہی ہے کہ گم شدہ افراد کہاں ہیں؟

- قانون کی رو سے قرآن مجید کی بے حرمتی ایک جرم ہے، جیسا کہ سیکشن ۲۹۵۔بی میں درج ہے۔''آپریشن سائیلنس'' کرنے والے افراد کے ہاتھوں قرآن مجید کی بے حرمتی نے پوری قوم کے جذبات کو مجروح کیا ہے اور جس طریقے سے لاشوں کو ٹھکانے لگایا گیا اور انھیں مسخ کیا گیا، اس نے بھی ہر شہری کو مضطرب کر دیا ہے۔

- جامعہ حفصہ کو غیر قانونی طور پر مسمار کرنے کے بعد ارباب حل وعقد، قتل کیے جانے والے افراد کی لاشوں کو چھپانے/موقع سے غائب کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور اس طرح منہدم عمارت کی جگہ پر موجود ملبے کو وہاں سے ہٹانے اور موجود شواہد کو بگاڑنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

- ان امور کے ذمہ دار افراد کی یہ کارروائی قانون کے عمل کو خراب کرنے اور انسانی حقوق میں مداخلت کے مترادف ہے۔

اس لیے مودبانہ درخواست کی جاتی ہے کہ:

۱۔درج ذیل افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دیا جائے:

جنرل پرویز مشرف، چیف آف آرمی اسٹاف،

وزیر داخلہ،

کور کمانڈر، ہیڈکوارٹر، ایکس کورز، راول پنڈی،

چیف کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور آئی جی اسلام آباد۔

۲۔مسمار کی جانے والی عمارت کے ملبے کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور جب تک باقاعدہ تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، نہ تو ملبے میں موجود شواہد کو بگاڑا جائے اور نہ اسے وہاں سے ہٹایا جائے۔

۳۔ذمہ داران کے خلاف سیکشن ۲۹۵۔بی کے تحت قرآن مجید کی دانستہ توہین اور لاشوں کی بے حرمتی کرنے کے فوج داری مقدمات درج کیے جائیں۔

۴۔سرنڈر کرنے کے بعد گرفتار کیے جانے والے افراد کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔

۵۔انتظامیہ کو حکم دیا جائے کہ وہ تمام گم شدہ افراد سے متعلق معلومات مہیا کرے۔''

یہ لال مسجد آپریشن کے خلاف وفاق المدارس کی رٹ درخواست کا متن ہے جس کے ذریعے

وفاق المدارس نے اس حوالے سے اپنی آئندہ جدو جہد کا رخ متعین کر لیا ہے اور میرے خیال میں وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کو اپنے ۱۸/اگست کے اجلاس میں اسی عدالتی و قانونی جدو جہد کو سنجیدگی اور ربط ونظم کے ساتھ آگے بڑھانے کی حکمت عملی طے کرنی چاہیے، کیونکہ یہ عدالتی جنگ اگر صحیح طریقے سے لڑی گئی تو اس کے انتہائی دوررس نتائج سامنے آئیں گے۔ باقی رہی بات عوامی تحریک کی تو میں اس سلسلے میں اپنے اس موقف پر پورے شرح صدر کے ساتھ قائم ہوں کہ یہ وفاق المدارس کا کام نہیں بلکہ دیگر دینی جماعتوں کی ذمہ داری ہے، البتہ اگر وفاق المدارس دینی جماعتوں کو اس سلسلے میں مشاورت کے لیے جمع کرنے کی غرض سے داعی اور میزبان کا کردار ادا کرنا چاہے تو اس میں بظاہر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

ضمیمہ

جناب حامد میر کے نام

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کا مکتوب

محترم جناب حامد میر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لال مسجد کے سانحے پر جس طرح پوری قوم صدمے سے نڈھال ہے، اس سے آپ سے زیادہ کون واقف ہوگا؟ اور اس سلسلے میں آپ نے جو موقف اختیار کیا اور جو کوششیں کیں، اللہ تعالیٰ اس کا بہترین اجر آپ کو عطا فرمائے۔ آمین۔

مورخہ ۱۶ر جولائی کو ''انتہا پسند کون'' کے عنوان سے آپ کا جو کالم جنگ میں شائع ہوا ہے، اس میں بھی آپ نے بڑی دردمندی سے صورت حال کے اصل اسباب کی نشان دہی کی ہے، لیکن مذاکرات کی آخری رات کے بارے میں آپ نے چند باتیں ایسی لکھی ہیں جن کے بارے میں آپ کو کسی نے غلط معلومات فراہم کی ہیں کیونکہ آپ بذات خود وہاں موجود نہیں تھے۔ چونکہ ان باتوں سے سنگین غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں، اس لیے صحیح صورت حال آپ کے سامنے لانا ضروری ہے۔

آپ نے اس رات کے واقعات جس طرح بیان فرمائے ہیں، ان سے تاثر یہ ملتا ہے کہ مذاکرات ٹوٹنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ علما کو جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ وفاق المدارس کی تحویل میں دینے پر اصرار تھا اور جب حکومت اس پر راضی نہیں ہوئی تو علما ناراض ہوکر اور مذاکرات کو ادھورا چھوڑ

کر چلے آئے، حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم لوگوں سے عبدالرشید غازی صاحب مرحوم نے جن نکات پر رضامندی کا اظہار کیا تھا، ان میں سب سے پہلا نکتہ یہ تھا کہ انھیں گرفتار یا نظر بند نہ کیا جائے گا، بلکہ ان کو ان کو اہل وعیال اور ذاتی سامان کے ساتھ ان کے اپنے گاؤں کے گھر بحفاظت پہنچا دیا جائے گا، پھر وہ وہیں قیام کریں گے۔ دوسرا نکتہ یہ تھا کہ وہ اپنے تمام ساتھیوں اور طلبہ وطالبات کے ساتھ باہر آئیں گے اور طالبات کو علما اور وزرا کی موجودہ مشترکہ کمیٹی اپنی نگرانی میں محفوظ مقام پر پہنچا کر ان کے سرپرستوں کے حوالے کرے گی اور طلبہ میں سے جن پر جامعہ حفصہ کے نزاع سے پہلے کے مقدمات نہیں ہیں، ان کو رہا کر دیا جائے۔ اور تیسرا نکتہ یہ تھا کہ وہ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو وفاق المدارس کی تحویل میں اور لال مسجد کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں دے کر جائیں گے۔

ان کی یہی باتیں وزیر اعظم کے ساتھ میٹنگ میں طے ہوگئیں، جس میں چودھری شجاعت حسین صاحب اور کئی وفاقی وزرا بھی شریک تھے اور وفاق المدارس کا مصالحتی وفد بھی۔ پھر شام کو وفاق المدارس کے علمائے کرام، وفاقی وزرا اور چودھری شجاعت صاحب نے لال مسجد کے پاس ایک جگہ بیٹھ کر انھی نکات پر مشتمل متفقہ تحریر اس طرح تیار کر لی تھی کہ اس کے کسی حصے پر اختلاف نہیں تھا، لیکن چودھری صاحب اور وزرا اس تحریر پر دستخط کرنے کے بجائے اس تحریر کی منظوری لینے کے لیے ایوان صدر چلے گئے اور جب یہ حضرات ایوان صدر سے واپس آئے تو ایک دوسری تحریر لے کر آئے جس میں یہ تینوں نکات بدل دیے گئے تھے۔ اس نئی تحریر میں پہلا نکتہ اس طرح لکھا گیا تھا کہ عبدالرشید غازی صاحب کو ''گھر'' میں (نہ کہ ان کے گھر میں) رکھا جائے گا، اور ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ ایک نکتہ یہ تھا کہ باہر آنے والے تمام لوگوں پر قانونی کے مطابق کارروائی کی جائے گی۔ اور ایک نکتہ یہ تھا کہ جامعہ حفصہ، جامعہ فریدیہ اور لال مسجد کا مستقبل محکمہ اوقاف اور وفاق المدارس اور دیگر حکومتی اداروں کے مشورے سے طے کیا جائے گا۔

اس پر ہم نے وزرا سے کہا کہ جن باتوں پر عبدالرشید غازی صاحب بمشکل راضی ہوئے تھے، اس تحریر میں وہ باتیں موجود نہیں ہیں، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کو بحفاظت ان کے گاؤں کے گھر پہنچانے کی جو بات طے ہوئی تھی، اس نئی تحریر میں اس کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ نیز عبدالرشید

غازی صاحب جامعہ حفصہ چھوڑنے پر اس شرط سے راضی ہوئے تھے کہ انھیں وفاق المدارس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ہم نے وزرا سے کہا کہ عبدالرشید غازی کو بار بار فون کر کے ہم نے بمشکل پہلی تحریر پر راضی کیا ہے، اب انھیں اس سے بالکل مختلف نئی تحریر پر راضی کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوگا، لہٰذا اس تحریر کو پہلی تحریر کے مطابق بنانا ضروری ہے۔ اس پر حکومت کے نمائندوں نے ہم سے کہا کہ اس نئی تحریر میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی کرنے کا ہمیں اختیار نہیں ہے اور ہمیں صرف آدھا گھنٹہ دیا گیا ہے جس میں سے پندرہ منٹ گزر چکے ہیں اور صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ ان پندرہ منٹ میں آپ ہاں یا نہیں کا فیصلہ کرا لیں۔ ہم نے کہا کہ اب ہم عبدالرشید غازی صاحب صاحب کو اس نئی تحریر پر راضی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، لیکن ان کے نمائندے مولانا فضل الرحمٰن خلیل صاحب موجود ہیں۔ آپ ان سے بات بات کر لیں، وہ ان کو راضی کر لیں تو بہت اچھی بات ہے۔ چنانچہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل صاحب نے عبدالرشید غازی صاحب مرحوم سے رابطہ کیا تو جیسا کہ خطرہ تھا، انھوں نے اس تحریر کا پہلا نکتہ سنتے ہی اس نئی تحریر کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی دوران فوج کے ایک افسر نے ہمارے ساتھیوں سے کہا کہ اب آپ حضرات یہاں سے چلے جائیں، چنانچہ اس کے بعد ہم انتہائی صدمے کی حالت میں ڈھائی بجے رات کو واپس آئے۔

اوپر کی تفصیل سے واضح ہے کہ مذاکرات کی ناکامی کا اصل سبب وفاق المدارس کی تحویل میں دینے کا مسئلہ ہرگز نہیں تھا بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ نئی تحریر میں انھیں بحفاظت گھر پہنچانے کے بجائے قانونی کارروائی کرنے کا ذکر تھا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ انھیں گرفتار کیا جائے گا، اور یہ وہ بات تھی جس پر غازی صاحب مرحوم ہم سے بار بار کئی دن سے کہہ رہے تھے کہ میں گرفتاری نہیں دوں گا، اگرچہ شہید کر دیا جاؤں۔

وفاق المدارس کی تحویل میں دینے کی بات بھی غازی صاحب مرحوم کی شرائط میں داخل تھی اور ہم نے اس کا ذکر اسی حیثیت میں کیا تھا، چنانچہ ساتھ ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ ہمیں اپنی طرف سے اس پر کوئی اصرار نہیں ہے۔ ان کو دینی مدرسہ کی حیثیت میں باقی رکھتے ہوئے آپ اگر چاہیں تو اسلام آباد و راولپنڈی کے علما کے سپرد کر دیں یا چودھری شجاعت حسین صاحب کے سپرد کر دیں۔ ہماری تو

شب و روز کی ان تھک کوشش اس لیے تھی کہ کسی طرح لال مسجد کے طلبہ وطالبات کی زندگیاں خطرے سے نکلیں۔ ہم ان دو مدرسوں کو وفاق المدارس کی تحویل میں دینے یا نہ دینے کی بحث میں الجھ کر اس عظیم مقصد کو کیسے خطرے میں ڈال سکتے تھے؟

کھانا منگوانے کی بات بھی آپ کے کالم میں سیاق وسباق سے کٹ کر آئی ہے۔ یہ کھانا بازار سے چودھری شجاعت حسین صاحب نے ازخود منگوایا تھا اور اس وقت منگوایا تھا جب حکومتی مذاکراتی ٹیم اور وفاق المدارس کے نمائندوں کے درمیان مصالحتی فارمولے پر اتفاق ہو گیا تھا اور مولانا عبد الرشید غازی مرحوم نے بھی اس سے اتفاق کر لیا تھا اور تمام شرکا پرامید اور قدرے مطمئن تھے۔ جب چودھری صاحب نے اپنے رفقا اور ہم سمیت کمرے میں موجود لوگوں کے لیے کھانا منگوایا تو اس وقت علما نے چودھری صاحب سے کہا کہ جامعہ حفصہ اور لال مسجد میں موجود افراد کئی دن سے کچھ نہیں کھا رہے، ہمیں ان کے لیے بھی کھانے کا ابھی سے انتظام کرنا چاہیے اور جب مصالحتی قرارداد پر دستخط ہو جائیں تو ہم خود اپنے ساتھ ان کے لیے کھانا لے کر جائیں گے۔ چنانچہ چودھری شجاعت حسین صاحب نے اس سے اتفاق کیا۔

اسی طرح دوران گفتگو قہقہے لگانے کی بات بھی درست نہیں ہے۔ اتنی طویل، سنجیدہ اور نازک گفتگو کے کے دوران اگر کسی نے کوئی ہنسی کی بات بھی کہہ دی ہو اور اس پر کچھ لوگ ہنس پڑے ہوں تو اسے اصل معاملے سے بے تعلق ہو کر قہقہے لگانے سے تعبیر کرنا بالکل غلط ہے۔ جن لوگوں نے کئی دن سے ملک کو خون ریزی سے بچانے کی کوشش میں اپنی نیندیں حرام کر رکھی تھیں، ان کے بارے میں جن حضرات نے بھی آپ کو یہ غلط معلومات فراہم کی ہیں، انھوں نے بڑی زیادتی کی ہے اور آپ سے یہ امید تھی کہ اس طرح کی اطلاعات ملنے سے پہلے ان باتوں کی تحقیق فرما لیتے۔

والسلام
محمد رفیع عثمانی
۲۰۰۷/۷/۱۷